کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ
جامعہ نگر (دہلی)

الاصلاح

دائرہ حمیدیہ کا ماہوار علمی و مذہبی رسالہ

مرتبہ

امین احسن اصلاحی

تصنیفات استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

تفسیر نظام القرآن

جن کو اللہ تعالیٰ نے کتاب الٰہی کے سمجھنے کا صحیح ذوق بخشا ہے۔ ان کا اتفاق ہے کہ اس وقت تک حضرت استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی کی تفسیر نظام القرآن سے بڑھکر کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی۔ اس تفسیر نے قرآن کی تمام مشکلات حل کر دی ہیں۔ استاذ امام کا طریقۂ تفسیر یہ ہے کہ پہلے سورہ کا عمود یعنی عنوان بحث بتلاتے ہیں پھر آیات کا باہمی نظم اور سابق و لاحق سورہ کا تعلق واضح کرتے ہیں۔ اس کے بعد سورہ کے تمام مشکل الفاظ اور مشکل اسالیب کو ایک ایک کرکے لیتے ہیں اور کلام عرب کی روشنی میں ان کو بے نقاب کرتے ہیں۔ پھر سورہ کے فلسفہ و اسرار اور اغراض و حکم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور صحیح نقل و صحیح عقل کی روشنی میں عجائب قرآنی اور حکم کتاب الٰہی کو اس طرح کھولتے ہیں کہ منکر سے منکر بھی قرآن کی بے پایاں عظمت کے سامنے سر جھکا دیتا ہے۔ اس عظیم الشان تفسیر کے مندرجہ ذیل اجزا چھپ چکے ہیں۔ اہل علم ان کی قدر کریں تاکہ بقیہ کی طبع و اشاعت کا سامان ہو۔

تفسیر سورۃ الذاریات: اس کتاب میں مولانا کی عام خصوصیات تفسیر کے علاوہ چند باتیں مخصوص اہمیت رکھتی ہیں۔ اس میں مصنف نے اپنے نظریہ کے مطابق ابتدائی قسموں کا عمود سورہ (دینونت) سے تعلق نہایت وضاحت کے ساتھ دکھایا ہے۔ اسی ضمن میں تمام اہم معذبہ مذکورہ قرآن کے اسباب ہلاکت کی تفصیل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقوام معذبہ کی ہلاکت میں ہواؤں کے تصرفات کو کتنا دخل رہا ہے۔ بنی اسرائیل کے مصر سے خروج کے وقت موج ہوا کے طوفان کے ظہور کی عظیم الشان تحقیق بھی اس ضمن میں آگئی ہے۔ "نطق" سے مراد اور "خلق زوجین" سے معاد اور رسالت پر استدلال کے جو پہلو بیان ہوئے ہیں ان کی قدر صرف اہل ذوق کر سکتے ہیں۔

قیمت [illegible] باقی سرورق صفحہ سوم پر ملاحظہ ہو

نمبر ۸ | ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۶ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۳۷ء | جلد ۲

فہرست مضامین

شذرات

مدرسۃ الاصلاح میں چھوٹے بچوں کے لئے ایک دارالاقامہ کی سخت ضرورت ہے۔ موجودہ دارالاقامہ میں مشکل سے سو طلبہ کے رہنے کی گنجائش ہے لیکن اس وقت کم و بیش ڈیڑھ سو طلبہ اس کے اندر رہتے ہیں۔ اس صورت حال کی وجہ سے طلبہ کو جو تکلیف اور منتظمین کو جو زحمتیں ہیں وہ آسانی سے نہیں بیان کیجا سکتیں۔ بالخصوص اس سال تو اس معاملہ نے کارکنوں کو سخت آزمائش میں ڈالدیا ان کو داخلہ کی بہت سی درخواستیں نامنظور کرنی پڑیں، اور جن طلبہ کو انھوں نے ہمت کرکے لے لیا ان کے لئے قیام کی معمولی سہولتیں مہیا کرنے میں بھی سخت مشکلیں پیش آرہی ہیں۔

مدرسۃ الاصلاح نے چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت کے معاملہ کو ابتداءً ایک خاص مقصد کی حیثیت سے پیش نظر رکھا ہے لیکن افسوس ہے کہ بعض دقتوں کی وجہ سے جن میں سب سے زیادہ اہم دارالاقامہ کی تنگی ہے، اب تک اس چیز کی طرف پوری توجہ نہیں کیجا سکی۔ لیکن اب اس معاملہ سے اغماض کرنا ناممکن ہے۔ موجودہ حالت یہ ہے کہ چھوٹے بچوں اور بڑے طلبہ کا تمام نظام بالکل مشترک ہے، جس کی وجہ سے ایک طرف تو چھوٹے بچے ان بہت سی راحتوں اور آسائیوں سے محروم ہیں جو ان کے عمر کے تقاضا سے ایک عمدہ دارالاقامہ میں ان کو حاصل ہونی چاہئیں۔ دوسری طرف ان کی تعلیم و تربیت، اور ان کی آزادی اور ان کے بڑھنے اور ابھرنے کی صلاحیت کو اس سے نقصان پہنچ رہا ہے۔

علاوہ ازیں ایک اور اہم سوال بھی منتظمین کے سامنے ہے۔ اب تک مدرسۃ الاصلاح کی تعلیم و تربیت کا فیض عموماً عامۂ مسلمین اور غربا تک محدود رہا ہے لیکن اب متوسطین کا طبقہ بھی اسکی طرف متوجہ ہورہا ہے۔ یہ لوگ

اپنے بچوں کو اس خواہش کے ساتھ مدرستہ الاصلاح میں بھیجنا چاہتے ہیں کہ دو تین سال وہ یہاں کے علمی و مذہبی ماحول میں رہکر ایسی مذہبی تعلیم و تربیت حاصل کرلیں جو آیندہ زندگی میں ان کیلئے مفید ہوسکے۔ اور قدرتی طور پر وہ اس امر کے بھی خواہش مند ہیں کہ ان کے لئے قیام و طعام اور نگرانی و تربیت کی مخصوص سہولتیں مہیا کیجائیں۔ اس قسم کی جو درخواستیں اب تک ہم کو موصول ہوتی تھیں، ہم اپنی دقتوں کی بنا پر ان کے جواب میں معذرت کرتے تھے لیکن اس کے لئے لوگوں کا اصرار اس درجہ بڑھتا جاتا ہے کہ مجبوراً ہم کو اس معاملہ پر غور کرنا پڑا۔ اور حق یہ ہے کہ اس معاملہ کا ایک پہلو ایسا ہے جس کی وجہ سے اس کی طرف توجہ نہ کرنا ایک قومی و مذہبی گناہ ہے۔ مسلمانوں میں امراء و متوسطین کے بچے عموماً انگریزی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور آج انگریزی مدارس اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کی فضاء اسلامی تعلیم و تربیت سے جسقدر بیگانہ ہے وہ معلوم ہے اس لئے اس طبقہ کے بچوں کی اگر کوئی دینی خدمت مدرستہ الاصلاح سے بن آئے تو دریغ نہ کرنا چاہئے کہ اگر ان میں سے ۵ فیصدی نے بھی اپنی آیندہ زندگی میں ہماری ابتدائی تعلیم و تربیت کا کوئی نقش باقی رکھا تو اس عہد میں دین و مذہب کی یہ کوئی معمولی خدمت نہیں ہوگی۔

پس ان حالات کی وجہ سے منتظمین نے بچوں کے لئے ایک علیحدہ دارالاقامہ کی تعمیر کا فیصلہ کیا ہے تاکہ مدرستہ الاصلاح کے مخصوص ماحول اور اس کے اغراض و مقاصد کو پیش نظر رکھکر ان کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک عمدہ نظام کا آغاز کیا جائے۔ اس نظام کا پورا خاکہ ہم کسی اور صحبت میں پیش کریں گے۔ سردست صرف اس قدر عرض کیا جاسکتا ہے کہ انشاءاللہ یہ نظام بچوں کی تعلیم و تربیت کا ایک بہترین نظام ہوگا۔ ہم نے اس کے بعض اجزاء کا تجربہ ؛ ولایق اور مستعد استاذوں کی نگرانی میں شروع کردیا ہے۔ ابھی کام کی ابتدا ہے اور بے شمار دقتیں حائل، لیکن ہم کو پوری امید ہے کہ یہ نظام کامیاب رہے گا اور وہ مسلمان جو چاہتے ہیں کہ کم سے کم مصارف میں ان کے بچے ایک مذہبی ماحول میں رہکر بہتر سے بہتر تربیت

حاصل کر سکیں اس سے پوری طرح مطمئن ہو سکیں گے۔

اس مقصد کیلئے ہم جو دارالاقامہ تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ فی الحال اس کے چھ کمرے تعمیر ہوں گے۔ ہر کمرے پر کم و بیش ساڑھے پانچ سو کی لاگت آئے گی۔ ایک ایسے زمانہ میں، جبکہ اقتصادی زبوں حالی کا شکوہ ہر زبان پر ہے، اتنی بڑی رقم حاصل کر لینا مشکل کام ہے، بالخصوص ایسی حالت میں تو اور بھی مشکل ہے جبکہ ہمارے سامنے روز کی روٹی کا سوال پوری اہمیت کے ساتھ ہے لیکن ہماری قوم میں ایسے ارباب کرم کی کمی نہیں ہے جو بہت آسانی کے ساتھ ایک ایک کمرے کی تعمیر کی ذمہ داری اپنے سر لے سکتے ہیں۔ اگر وہ توجہ کریں گے تو ہم چند دنوں میں اس کام سے فارغ ہو جائیں گے۔ پس ہم سب سے پہلے انہی کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے ناموں سے ایک ایک کمرہ اس دارالاقامہ کے اندر تعمیر کرادیں۔ وہ اس کام میں اپنا روپیہ صرف کر کے اپنی قومی و مذہبی تعلیم کی ایک ایسی خدمت انجام دیں گے جو انشاءاللہ ان کی قوم کے رتبہ کو اونچا کریگی۔ اس کے بعد ہم اپنے عام مسلمان بھائیوں سے امداد کی درخواست کرتے ہیں کہ جس طرح انھوں نے مدرسۃ الاصلاح کے ہر ارادہ کی تکمیل میں کارکنوں کی مدد کی ہے اسی طرح اس موقع پر بھی ہماری مدد کریں۔

ہم کو امید ہے کہ ہماری قوم کے اغنیاء اس اپیل پر توجہ کریں گے۔ ہم نے یہ ارادہ محض اس شوق میں نہیں کیا ہے کہ مدرسۃ کی عمارات میں اضافہ ہو جائے۔ بلکہ ضرورت نے مجبور کیا ہے کہ حالات کی ناسازگاری کے باوجود ہم یہ ارادہ کریں۔ اللہ تعالی ہماری اور تمام مسلمانوں کی مدد فرمائے۔

کتبخانہ مدرسۃ الاصلاح کی امداد کے لئے جو اپیل ان صفحات میں کی گئی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ ارباب کرم نے اس کی طرف توجہ فرمائی۔ اب تک جن ہمدردوں نے اس سلسلہ میں کوئی اعانت فرمائی ہے اس کی تفصیلات ہم قارئین کو پہنچا چکے ہیں۔ آج ایک تازہ بشارت سناتے ہیں۔

رنگون میں، ملا محمد داؤد صاحب مدنی، ایک ذی علم اور صاحب خیر بزرگ ہیں۔ ان کو مدرسۃ الاصلاح کے ساتھ خاص شغف ہے۔ مدرسۃ الاصلاح کے وفود کی پذیرائی اور ان کی امداد و اعانت میں انھوں نے ہمیشہ فیاضی اور سیر چشمی سے حصہ لیا۔ ان کی ملکیت میں عربی کتب کا ایک عمدہ کتبخانہ ہے جو تمامتر مشہور ائمہ و مصنفین و علمائے اسلام کی تالیفات پر مشتمل ہے۔ کتبخانہ مدرسۃ الاصلاح کی اپیل، ہمارے عزیز مولوی نورالہدیٰ صاحب اصلاحی کی وساطت سے موصوف تک بھی پہنچی اور موصوف نے اپنے کتبخانہ کا ایک قیمتی حصہ مدرسۃ الاصلاح کے کتبخانہ کے لئے مرحمت فرمایا۔ مولوی نور الہدیٰ صاحب اصلاحی نے کتابوں کی فہرست ہمارے پاس بھیجی ہے۔ یہ کتابیں تعداد میں نوے ۹۰ ہیں، جنمیں سے بعض بعض متعدد جلدوں میں ہیں۔ اور الحمدللہ یہ مجموعہ محض رطب و یابس کا ڈھیر نہیں ہے۔ نہایت مفید اور قیمتی کتابوں پر مشتمل ہے۔ ابن تیمیہ، ابن قیم، عبدالوہاب شعرانی، امام سیوطی، ابن رشد، علامہ بزدوی، ابوجعفر نحاس، امام غزالی، دبوسی، جاحظ، عیسی ہمدانی، محی الدین بن عربی، ابن مسکویہ فیضی، شرطونی کے ناموں سے کون ناواقف ہوگا؟ زیادہ تر کتابیں انہی مصنفین کی ہیں۔ اوریقینا ان کے اضافہ سے مدرسۃ الاصلاح کے کتبخانہ کی عزت بڑھگئی ہے۔ ہم مدرسۃ الاصلاح کے کارکنوں اور اس کے تمام اساتذہ و طلبہ کی طرف سے مدنی صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اللہ تعالی مدنی صاحب کو جزائے خیر دے۔

کتبخانہ کے لئے ہم نے جب جب اپیلیں کی ہیں یہ بات خاص طور پر ہمارے پیش نظر رہی ہے کہ یہ اپیل ان لوگوں کے کانوں تک پہنچے جن کی ملکیت میں کتابوں کے ذخیرے ہیں۔ کیونکہ بغیر اس کے مدرسۃ الاصلاح کے کتبخانہ کا پیٹ بھرنا مشکل ہے۔ اللہ تعالی کا شکر ہے کہ مدنی صاحب نے ہماری اپیل پر توجہ فرماکر دوسروں کے لئے راہ کھول دی۔ ہم کو امید ہے کہ دوسرے ارباب علم اس عمدہ مثال

کی پیروی کریں گے اور مدرستہ الاصلاح کے کتبخانہ کی امداد کتابیں بھیجکر فرمائیں گے۔ مدرستہ الاصلاح کے ہمدردوں میں بہت سے ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کے پاس کتابیں موجود ہوں گی اوران سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا جاتا ہوگا۔ ان سے درخواست ہے کہ وہ اپنی کتابیں مدرستہ الاصلاح کے کتبخانہ کو عنایت فرمائیں کہ طلبہ اور علماء ان سے استفادہ کریں۔ ان کو کیڑوں کی خوراک بنانے سے کیا فائدہ؟

تفسیر سُورۃ الشمس، جس کے ترجمہ کی آخری قسط اس پرچہ میں نکل رہی ہے، استاذ امام رحمتہ اللہ علیہ کے عام انداز تفسیر سے کسی قدر مختلف ہے۔ اس میں مولانا بعض اشارات کی رہنمائی میں بعض ذوقی مباحث کی طرف نکل گئے ہیں۔ جن سے ممکن ہے بعض لوگ متفق نہ ہوں۔ پچھلے پرچہ کو دیکھکر ایک عزیز نے اس کے اس حصہ کے متعلق اپنے تردد کا اظہار کیا تھا جسمیں مولانا نے حضرت علیؓ کو اس امت میں ناقۂ ثمود کی مثال قرار دیا ہے۔ اس طرح کے مباحث کے متعلق یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے کہ انکی بنیاد محض ذوق اور اشارات پر ہوتی ہے۔ اس لئے ضرور نہیں کہ ہر شخص ان سے متفق ہوسکے۔ ان کو عقائد وایمانیات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بات قرین قیاس اور لگتی ہوئی نظر آئے۔ قبول کر لیجئے۔ اور اگر دل کو نہ بھائے، ذوق ابا کرے، چھوڑ دیجئے۔ مصنف نے خود اس امر کی تشریح کردی ہے۔ اوران کے دلائل ان کے نقطۂ نظر کو واضح کردینے کے بالکل کافی ہیں۔

آجکل مسلم نوجوانوں نے وقت کے حالات سے متاثر ہوکر جو کروٹ بدلی ہے اس سے ہمارے سن رسیدہ مذہبی پیشواؤں کو بڑا تردد لاحق ہوگیا ہے۔ ان کو اندیشہ ہے کہ یہ نوجوان کانگریس میں جاکر ہند و تہذیب وتمدن کے مقلد اور بالکل بے دین ہوجائیں گے۔ یہ اندیشہ ایک حد تک بجا ہے لیکن اس خطرہ کا علاج کیا ہے؟ نوجوانوں نے جو اقدام کیا ہے یہ ان کی عمر کا تقاضا ہے۔ ان کے خون میں

حرارت ہے اور حرارت اپنا ایک طبعی خاصہ اور اثر رکھتی ہے۔ پس نوجوان بوڑھوں کیطرح سو نہیں سکتے، اپنی طبیعت سے مجبور ہیں کہ کچھ نہ کچھ کریں اور ایسا کام کریں جسمیں زندگی کی سرگرمی اور ولولہ کار کا ہیجان ہو، غیرت و حمیت کا مظاہرہ ہو، قربانی اور ایثار کی بلند نظری ہو، مرنے اور مٹنے کی لذت ہو۔

مسلمانوں کے اندر عرصہ سے یہ کاروبار بند ہے۔ علماء مدرسوں میں اور صوفیا خانقاہوں میں پڑے ہوئے سو رہے ہیں اور دوسروں کو بھی سو جانے کی دعوت دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دعوت نوجوانوں کو کبھی پسند نہ آئے گی۔ ایک زمانہ تک یہ ہوا کہ ان کے بڑے بوڑھے سوتے رہے۔ اور وہ معلوم نہیں گمراہی کی کن کن وادیوں میں بھٹکتے پھرے۔ اب وہ اپنی اس ہرزہ گردی سے اکتا گئے ہیں۔ ان کی آنکھیں کھل رہی ہیں۔ وہ اپنے سامنے نوجوانوں کی ایک صف دیکھ رہے ہیں جو جوش سے بھری ہوئی، امنگوں سے تنی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔ اور اس کے آگے آگے بوڑھوں اور سیانوں کی ایک جماعت ہے جو ایثار، قربانی، جانبازی اور تدبیر میں آپ اپنی نظیر ہے۔ ان کو ایسے خوش قسمت نوجوانوں اور ایسے قابل اور بہادر بوڑھوں پر رشک آتا ہے۔ اور وہ بیتاب ہو ہو کر چاہتے ہیں کہ انہی کے ساتھ نکل جائیں۔ وہ اپنی مُردوں کی بستی سے بیزار ہو گئے ہیں اور قبروں سے جو آوازیں اب تک سنتے رہے ہیں ان سے ان کے کان تھک چکے ہیں۔ اب وہ زندگی اور عمل کے کھوج میں نکلے ہیں۔ پس جن لوگوں کو ان کا مذہب اور ایمان عزیز ہو ان کو چاہیے کہ ڈلبستروں سے اٹھیں اور ان کے آگے آگے چلکر ان کی رہنمائی کریں۔ جو لوگ پیچھے بیٹھے ہوئے دور ہی دور سے ان کو ملامت کر رہے ہیں ان کی ملامتیں اب کچھ کارگر نہیں ہو سکتیں۔

ہم کو پورا اطمینان ہے کہ اگر ہمارے علماء میدان عمل کی اگلی صف میں آجائیں اور ایثار و قربانی اور فکر و تدبر کی ویسی مثالیں پیش کریں جیسی ان کے شایان شان ہیں تو ہماری قوم کے نوجوان کبھی گمراہ نہ ہوں گے۔ اسلام اور اسلامی روایات کی جن باتوں سے آج ان کے اندر ایک عام بے رغبتی پیدا ہو گئی ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آج جو لوگ ان چیزوں کے داعی ہیں وہ "نفی محض" ہو کر رہ گئے ہیں۔ یعنی دنیا کے اندر جتنے کام ہیں ان کے نزدیک سب باطل اور گمراہ کن ہیں لیکن اگر ان سے سوال کیا جائے کہ ٹھیک کام کیا ہے تو اس کا جواب یا تو دیتے نہیں یا دیتے ہیں تو اس کو سنکر انکی پست ہمتی اور اپنی بدقسمتی پر افسوس ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک پست ہمت جماعت کی کوئی چیز عزت نہیں پا سکتی۔ یہانتک کہ اس کی خوبیاں بھی آہستہ آہستہ برائیاں بن جاتی ہیں۔ اس کے برعکس جو بہادر اور بلند نظر ہیں وہ اپنی برائیوں کو بھی دنیا کی نگاہوں میں باعزت بنا دیتے ہیں۔ پس اگر ہمارے علماء چاہتے ہیں کہ ہماری قوم کے نوجوانوں کے دلوں میں مذہبی و قومی روایات کی جگہ باقی رہے تو اس کی صرف ایک ہی سبیل ہے کہ وہ اپنے اعمال سے ان چیزوں کو عزت دیں۔ اگر عمل اور کردار کا جادو قدیم ہندستان کی جاہلانہ حماقتوں کو اس بیسویں صدی میں "حکمت و فلسفہ" کے نام سے پجوا سکتا ہے تو دنیا کی کوئی قوم اسلام اور اسلامی روایات کو مٹانے پر قادر نہیں ہے۔ لیکن ہمتوں کا فرق دیکھئے! ایک وہ ہیں جو اس عقل و دانش کے زمانہ میں گائے پجوا رہے ہیں، مورتوں کے سامنے سجدے کرا رہے ہیں۔ اور مٹے ہوئے ہندوستان کی نہ جانے کن کن خرافات کو زندہ کر رہے ہیں اور انھیں مستقبل کی طرف سے کوئی اندیشہ نہیں اور ایک ہم ہیں کہ کانپ رہے ہیں کہ کہیں مسلمان کانگریس میں جا کر خدا کو چھوڑ کر گائے کی عبادت نہ شروع کر دیں۔ سچ کہا ہے۔

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے

معارف القرآن

تفسیر سورۃ الشمس

(۴)

تالیف :۔ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ

ترجمہ :۔ امین احسن اصلاحی

حضرت عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کی مثالیں

۱۲۔ تم کہو گے کہ حضرت علیؓ سے پہلے حضرت عثمانؓ نہایت مظلومیت اور بیکسی کی حالت میں قتل ہوئے، جن کے بعد فتنوں کا دروازہ کھل گیا۔ حضرت فاروق اعظمؓ شہید ہوئے جن کی شہادت تاریخ اسلام کا سب سے بڑا حادثہ ہے۔ سب سے آخر میں حضرت امام حسینؓ قتل ہوئے، جن کی مظلومیت تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گی، پھر ہم نے ان میں سے کسی کے واقعہ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ سے کیوں نہیں تشبیہ دی؟ اس کے لئے حضرت علیؓ ہی کے واقعہ کو کیوں انتخاب کیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی شہادت کا واقعہ ایک مخصوص نوعیت رکھتا ہے۔ آپ کے قتل کی ذمہ داری اس امت پر نہیں ہے۔ آپ کو ایک عیسائی نے شہید کیا۔ اسی لئے حضرت عمرؓ نے جب سنا کہ آپ کا قاتل ایک نصرانی ہے، تو نہایت خوش ہوئے کہ امت آپ کے قتل کے وبال سے بچ گئی۔ صرف تھوڑے سے اشرار اس جرم سے راضی تھے اور چونکہ یہ پہلا خون تھا اس لئے قانون الٰہی نے امہال سے

کام لیا۔ پس حضرت عمرؓ حضرت ذکریا علیہ السلام سے زیادہ اشبہ نظر آتے ہیں۔ جس طرح وہ قربان گاہ اور مسجد کے درمیان قتل ہوئے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ بھی نماز کے اندر شہید ہوئے۔ اسی لئے حضرت کعبؓ نے فرمایا کہ "حضرت عمرؓ کا حلیہ تورات کے اندر موجود ہے"۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ حضرت عمرؓ کی بہت سی صفتیں توراۃ میں بیان ہوئی ہیں۔ آیت " ذلک مثلهم فی التوراۃ ومثلهم فی الانجیل " کی تفسیر کے ذیل میں بعض ضروری باتیں ملیں گی۔

حضرت عثمانؓ کی حالت حضرت یحییٰ علیہ السلام کی حالت سے زیادہ اشبہ ہے جس طرح حضرت یحییٰ علیہ السلام قید کی حالت میں قتل کئے گئے، اسی طرح حضرت عثمانؓ مکان کے اندر بند کرکے شہید کئے گئے۔ پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ سے جو مشابہت حضرت علیؓ کے واقعہ کو ہے، وہ کسی دوسرے واقعہ کو نہیں ہے۔ نتائج کے اعتبار سے بھی دونوں بالکل یکساں درجہ کی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کا ارادہ کرکے خدا کی امانت سے محروم ہوگئے۔ اور مسلمان حضرت علیؓ کے قتل کی ذمہ داری لے کر خلافت مقدسہ سے محروم ہوگئے۔

باقی رہا حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا معاملہ، تو یہ تو ملت مرحومہ کے سینہ کا وہ زخم ہے، جو ہمیشہ تازہ رہے گا۔ اور تاریخ کبھی اس کو فراموش نہ کر سکے گی۔ اور یہ درحقیقت اسی بدبختی کا ایک مظہر ہے، جو حضرت علیؓ کے قتل کی صورت میں نمودار ہوئی تھی۔ زہیر نے جنگ کے نتائج کو احمر عاد سے تشبیہ دی ہے، اور کیا خوب بات کہی ہے۔

فتنتج لکم غلمان اشأم کلهم — کاحمر عاد ثم ترضع فتفطم

درحقیقت ایک برائی دس برائیوں کا دروازہ کھولتی ہے۔ پس حضرت علیؓ کے قتل کی صورت میں جو شقاوت ظاہر ہوئی، اسی کی پرورش و رضاعت سے وہ حادثہ ظہور میں آیا، جو حضرت امام حسینؓ کی مظلومانہ شہادت کی شکل میں ظاہر ہوا اور پھر اس واقعہ کی جڑ سے اس طرح کے ہزارہا فتنوں کی

شاخیں پھوٹیں اور پھیلیں اور ان کے سموم اور مہلک ثمرات نہ جانے کن کن صورتوں میں نمودار ہوئے۔ یہ مسلمانوں کے جان و مال کی اباحت تک جو ہولناک اور شرمناک واقعات بار بار پیش آئے یہ سب اسی شجرۂ ملعونہ فساد کے برگ و بار تھے۔ اور یہی فتنے تھے جن سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبۃ الوداع میں آگاہ فرما دیا تھا کہ

یا ایھا الناس انما المومنون	لوگو، تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔
اخوۃ ولا یحل لامری مال اخیہ	کسی شخص کیلئے یہ بات جائز نہ ہوگی کہ اپنے بھائی
الا عن طیب نفس منہ الا	کا مال لے لے مگر اس کی اجازت اور خوشی سے۔
ھل بلغت، اللھم اشھد فلا ترجعن	آگاہ، میں نے خدا کا پیغام پہنچا دیا۔ اے اللہ تو گواہ رہ۔ پس اے لوگو، نہ ہو کہ تم میرے بعد حالت کفر میں
بعدی کفارا۔ یضرب بعضکم	لوٹ جاؤ تم میں سے ایک دوسرے کی گردن مارنے لگے۔
رقاب بعض	

قرآن مجید نے بھی باہمی جنگ وجدل کو عذاب الٰہی سے تعبیر فرمایا ہے۔ سورہ انعام میں ہے:۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ	کہہ دو، کہ وہ قادر ہے اس بات پر کہ تم پر عذاب بھیجے
عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ	تمہارے اوپر سے یا تمہارے قدموں کے نیچے سے یا تم کو
اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ	گروہ در گروہ کرکے تم کو باہم ٹکرا دے اور ایک کو دوسرے
بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ۔ اُنْظُرْ كَيْفَ	کا عذاب چکھائے دیکھو، ہم اپنی آیتیں کس طرح
نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ	پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں

چنانچہ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد یہ عذاب نمودار ہوگیا۔ امت مختلف گروہوں میں بٹ گئی۔ اور حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی جماعتوں میں ایسی خونریز جنگیں ہوئیں کہ مسلمان بالکل بے دم ہو کے رہ گئے۔ اور جیسا کہ قرآن مجید میں وارد ہے، اللہ تعالیٰ نے ایک جماعت کا عذاب دوسری جماعت کو

پکھا دیا اور یہ آگ برابر مشتعل رہی۔ بلکہ یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ اس کے بعد مسلمانوں پر جتنی آفتیں نازل ہوئیں وہ تمام تر انہی دونوں گروہوں یا اسی قبیل کی جماعتوں کے ہاتھوں نازل ہوئیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ گروہ بندی اور تفریق اس درجہ مبغوض تھی کہ اس نے اپنے پیغمبر کو اس سے بالکل بری قرار دیا تھا چنانچہ فرمایا:۔ "ان الذین فرقوا دینہم وکانوا شیعا لست منہم فی شئ" جنھوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کردیا، اور گروہ گروہ بن گئے، تم کو ان سے کوئی علاقہ نہیں۔ اسی طرح ایک اور موقع پر بھی باہمی جنگ وجدل کو عذاب سے تعبیر فرمایا ہے۔" ومن الذین قالوا انا نصاریٰ اخذنا میثاقہم فنسوا حظاً مما ذکروا بہ فاغرینا بینہم العداوۃ والبغضاء الی یوم القیمۃ"۔ اور ان لوگوں میں سے جنھوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ ہم نے ان سے بھی میثاق لیا، پس وہ بھول گئے ایک حصہ اس چیز کا جس کے ذریعہ ان لوگوں کو تذکیر کی گئی تھی (یعنی کتاب الٰہی) پس ہم نے بھڑکادی ان کے درمیان عداوت اور بغض کی آگ قیامت تک کے لئے۔

اس بحث کی اصلی جگہ سورہ حجرات ہے، اس لئے یہاں ان اشارات پر ہم کفایت کرتے ہیں۔

سورہ کے ربط پر دوبارہ نظر

۱۴۔ اس سورہ میں بدبختی اور شقاوت کے انجام کی تفصیل کی ہے۔ گویا پوری سورہ "وقد خاب من دسّٰہا" کے اجمال کی تشریح ہے۔ اور "قد افلح من زکّٰہا" میں فلاح کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اس کا ذکر اس سورہ میں مجمل چھوڑدیا ہے۔ اس کی توضیح نہیں فرمائی۔ اس کی توضیح بعد کی سورہ (سورۃ اللیل) میں کی ہے

ماسبق سورہ سے ربط کا پہلو یہ ہے کہ اس میں بتایا تھا کہ بیت اللہ کے چند مقاصد ہیں۔ ایمان صبر، مرحمہ اور توصیۂ حق وصبر۔ جو لوگ ان چیزوں کو اختیار کریں گے ان کے لئے کامیابی اور نصرت کی

نعمتیں دیاں ہوں گی اور وہ اصحاب المیمنہ میں ہوں گے۔ اور جو ان سے اعراض کریں گے، ان کیلئے بدبختی اور شقاوت کی لعنتیں ہوں گی اور وہ اصحاب المشئمہ میں ہوں گے۔ پس اس سورہ میں قریش کے لئے اس بدبختی اور شقاوت کی ایک مثال بیان کی۔ اور اس کے لئے قوم ثمود کے واقعہ کو بطور مثال کے اختیار فرمایا۔ اس پہلو سے یہ سورہ، سابق و لاحق دونوں سے مربوط ہو جاتی ہے اور اس کا موقع وہی ہے جو سورہ ماعون کا ہے، جیسا کہ اس کی تفسیر سے واضح ہوگا۔

لیکن اگر ان تمام سابق و لاحق تعلقات سے قطع نظر کر لیا جائے، جب بھی یہ سورہ اپنے اندر ایک مستقل تعلیم حکمت رکھتی ہے۔ یعنی اس میں سرکشی اور تکذیب کے نتائج پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دئے گئے ہیں۔ پس اگر تم اپنی نظر کو اسی سورہ کے مطالب تک محدود رکھو، اور اس کے پیش و عقب تک نہ پھیل سکو، جب بھی اس کی تعلیمات کم از کم سرکشی اور تکذیب کے داعیہ کو اکھاڑ پھینکنے کے لئے تو بالکل کافی ہیں۔ ہاں اگر اس کو سابق و لاحق سے ملا کر دیکھو گے تو تم پر بعض نئی حقیقتوں کا انکشاف ہوگا۔ تم کو اس بیماری کی جڑ اور اس بدبختی کی اصل بنیاد کا سراغ لگ جائے گا۔ یعنی یہ معلوم ہو جائے گا کہ ان تمام مفاسد کی اصل درحقیقت قساوت قلب ہے۔ اس کے متعلق ہم نے سابق سورہ کی تفسیر میں مفصل بحث کی ہے۔ وہاں ہم نے دکھایا ہے کہ جہالت، بخالت، اور سرکشی وغیرہ، تمام برائیوں کا اصل سرچشمہ قساوت قلب ہی ہے۔

"ولا یخاف عقبٰہا" کی تفسیر

۱۴۔ قرآن مجید، جس طرح اگلے صحیفوں کا مصدق اور متمم ہے۔ اسی طرح وہ ان کے اختلافات کے باب میں حکم اور مہیمن ہے۔ اپنی یہ حیثیت قرآن مجید نے خود نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کر دی ہے۔ ایک جگہ تورات اور انجیل کے بیان کے بعد قرآن کا ذکر ان لفظوں میں آتا ہے۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَیْمِنًا عَلَیْهِ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ

اور ہم نے اتاری تم پر کتاب حق کے ساتھ تصدیق کرتی ہوئی اس چیز کی جو اس کے آگے (پہلے) ہی کتاب میں سے (یعنی قدیم صحیفے) اور نگراں ہے اس پر، پس فیصلہ کرو ان کے درمیان اس چیز کے مطابق جو اللہ نے اتاری ہے اور نہ پیروی کرو انکی خواہشوں کی (یعنی انکی تحریفات کی) چھوڑ کر اس حق کو جو تمہارے پاس آچکا ہے

دوسرے مقام پر ہے۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَقُصُّ عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَكْثَرَ الَّذِیْ هُمْ فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ

بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل پر بیان کرتا ہے بڑا حصہ ان باتوں کا جنمیں وہ مختلف ہیں۔

قرآن مجید اپنے اسی منصب کے لحاظ سے، جہاں اگلے صحیفوں کی بہت سی باتوں کی تصدیق کرتا ہے، وہیں ان کی بہت سی ایسی باتوں کی، جو یہود نے ان میں ملا دی ہیں، اور جن کو حقیقت سے کوئی علاقہ نہیں ہے، نہایت ہی زور و قوت کے ساتھ تردید بھی کرتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:۔ "ولقد خلقنا السموٰت والارض وما بینهما فی ستة ایام" (اور ہم نے پیدا کیا آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ دنوں میں) یہاں تک تو بعینہ توراۃ کے بیان کی تصدیق تھی۔ پھر اس کے بعد فرمایا "وما مسنا من لغوب (اور ہم کو ذرا بھی تکان نہیں محسوس ہوئی) یہ ٹکڑا قرآن مجید کے مہیمن اور حکم ہونے کی حیثیت کو نمایاں کر رہا ہے۔ یعنی اس میں توراۃ باب پیدائش کے اس بیان کی تردید ہے جو یہود نے ملا دیا ہے کہ خداوند نے چھ دن کام کیا اور ساتویں دن آرام کیا۔

اس اسلوب کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔ قرآن مجید کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی باتیں کہتا

چلا جاتا ہے اور انہی کے لپیٹ میں کوئی ایسی بات کہدیتا ہے جس سے کسی خاص خیال کی تردید یا کسی مخصوص غلط فہمی کی اصلاح مقصود ہوتی ہے۔

اس تمہید کو ذہن نشین کر لینے کے بعد، زیر بحث مقام پر غور کرو۔

اللہ تعالیٰ کے متعلق جہاں بہت سی غلط فہمیاں لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں، وہاں ایک غلط فہمی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ان بہت سے کاموں پر، جو رحمت و نعمت کے اس سے صادر ہوتے ہیں کبھی کبھی پچھتایا بھی کرتا ہے۔ چنانچہ اس کی ایک دلچسپ مثال یہود کی عنایت سے توراۃ کی کتاب پیدائش ۲ میں بھی ہے۔

"اور خداوند نے دیکھا کہ زمین پر انسان کی بدی بہت بڑھ گئی ہے اور اسکے دل کے تصور اور خیال سدا بڑے ہی ہوتے ہیں، تب خداوند زمین پر انسان کو پیدا کرنے سے ملول ہوا اور دل میں غم کیا"

اسی طرح طوفان کے ذکر کے بعد ہے۔

"اور خداوند نے اپنے دل میں کہا کہ انسان کے سبب سے میں پھر کبھی زمین پر لعنت نہیں بھیجوں گا کیونکہ انسان کے دل کا خیال لڑکپن سے برا ہے اور نہ پھر سب جانداروں کو جیسا اب کیا ہے مار وں گا"

قرآن کی تعلیم اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتا ہے حکمت و رحمت کے ساتھ کرتا ہے۔ اگر وہ کسی قوم کو ہلاک کرتا ہے، یا کسی قوم کو رفعت و ترقی بخشتا ہے تو ایسا بغیر کسی ضابطہ اور اصول کے نہیں کرتا۔ اپنے اس قانون حکمت و رحمت کے مطابق کرتا ہے جو اس نے اپنے تمام کاموں کے لئے ازل سے ٹھہرا لیا ہے۔ پس اس کے کسی کام میں نہ خوف و طمع کا شائبہ ہے، نہ کمی بیشی کا اندیشہ۔ اور اس لئے وہ ندامت و شرمندگی اور رنج و پچھتاوے کے تمام احوال و عوارض سے بالکل منزہ اور ارفع ہے۔ یہی حقیقت ہے جو یہاں "ولا یخاف عقبٰھا" سے واضح ہو رہی ہے۔

اور اس طرح کی کتنی حقیقتیں ہیں، جو قرآن کی برکت سے، اللہ تعالیٰ نے ہم پر روشن فرما دی ہیں۔ حالانکہ دوسرے قرآن مجید کی روشنی سے محروم ہونے کی وجہ سے ان سے دور ہیں۔ فالحمد للہ تعالیٰ علی ما ھدانا الی الصراط المستقیم و اعطانا من الذکر الحکیم۔

(۲)

امین احسن اصلاحی

تین جماعتیں اوپر ہم نے بن دو جماعتوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ بالکل اصولی تقسیم تھی۔ قرآن مجید نے اس سے زیادہ تجزیہ وتحلیل اور بسط وتفصیل کے ساتھ اس معاملہ میں ہماری رہنمائی کی ہے۔

قرآن مجید کس مقصد کے لئے نازل ہوا ہے؟ اس کا جواب خود قرآن نے ان لفظوں میں دیا ہے:-

كِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ	یہ کتاب آسمانی ہے جس کو ہم نے تم پر اسلئے اتارا ہو کہ
النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ	تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لیجاؤ۔
بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ	ان کے رب کے حکم سے، خدائے عزیز وحمید کے
الْحَمِيْدِ	راستہ کی طرف۔

یعنی قرآن مجید کا مقصد لوگوں کو گمراہی وضلالت کی تاریکی سے نکال کر ایمان وہدایت کی روشنی میں لانا ہے۔ اور یہ کام ایک مخصوص قانون کے مطابق انجام پاتا ہے۔ کیونکہ فرمایا ہے "باذن ربھم" یعنی یہ پیغمبر کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ جس کو چاہے ہدایت وایمان بخشدے، یہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، وہ جس کو چاہتا ایمان سے بہرہ ور فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے گمراہی کے کھڈ میں گرادیتا ہے۔ اور اس کا یہ چاہنا ایک قانون حکمت کے مطابق ہے۔ وہ قانون حکمت کیا ہے؟ اس کا جواب قرآن مجید نے متعدد مقامات میں دیا ہے لیکن سورہ بقرہ کے آخر میں تعلیم حکمت کے باب میں اس پر نسبتہً زیادہ تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اس لئے ہم اسی مقام کو اس معاملہ کی توضیح کے لئے منتخب کرتے ہیں۔ فرمایا:-

اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَوْلِیٰٓءُھُمُ الطَّاغُوْتُ یُخْرِجُوْنَھُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ

اللہ ان لوگوں کا مددگار ہے جو ایمان لائے انکو نکالتا ہے تاریکیوں سے روشنی کی طرف ، اور جنھوں نے کفر کیا تو ان کے مددگار طاغوت ہیں وہ انکو نکالتے ہیں روشنی سے تاریکی کی طرف وہی لوگ جہنم میں پڑنے والے ہیں ، اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

یعنی اللہ اور اس کی کتاب کی رہنمائی صرف اہل ایمان کے لئے مخصوص ہے ، اہل کفر اس سے محروم ہیں اہل کفر کے رہبر و مددگار طاغوت ہیں ، وہ ان کو روشنی میں نہیں آنے دیتے اور اگر کبھی روشنی کی کوئی کرن انکے سروں پر جھلک جاتی ہے تو وہ فوراً ان کو دھکیل کر تاریکی کے سیاہ پردوں میں چھپا دیتے ہیں کہ کہیں وہ اس راز سے آشنا نہ ہو جائیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی مثال بیان کی ہے جن کو تاریکی سے روشنی کی طرف نکالتا ہے یا جن کو تاریکی میں چھوڑ دیتا ہے۔ اور اس کے لئے تین شخصوں کو منتخب کیا ہے جو درحقیقت تین جماعتوں کے نمایندے ہیں۔ فرمایا :-

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰھٖمَ فِیْ رَبِّہٖٓ اَنْ اٰتٰہُ اللّٰہُ الْمُلْکَ اِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ قَالَ اِبْرٰھٖمُ فَاِنَّ اللّٰہَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِھَا مِنَ الْمَغْرِبِ

کیا تم نے اس شخص کے حال پر نظر نہیں کی جو ابراہیم سے اس کے رب کے بارہ میں جھگڑنے لگا۔ اس وجہ سے کہ اللہ نے اس کو سلطنت دے رکھی تھی جب ابراہیم نے اس سے کہا ، میرا رب تو وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے تو اس نے کہا میں جلاتا ہوں اور مارتا ہوں ابراہیم نے کہا (اچھا) اللہ تو آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہے

فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ ۗ وَاللّٰهُ لَا
يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِينَ ۚ أَوْ كَا
لَّذِي مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ
عَلٰى عُرُوشِهَا ۚ قَالَ أَنّٰى يُحْيِي هٰذِهِ
اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَأَمَاتَهُ اللّٰهُ
مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ ۖ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۖ
قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۖ
قَالَ بَلْ لَبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ
إِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۖ
وَانْظُرْ إِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً
لِلنَّاسِ وَانْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ
نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا ۚ فَلَمَّا
تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللّٰهَ
عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۞ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ
رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتٰى ۖ قَالَ
أَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۖ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِيَطْمَئِنَّ
قَلْبِي ۖ قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِنَ الطَّيْرِ
فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى
كُلِّ جَبَلٍ مِنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ

تم اسکو مغرب سے نکالو تو اسپر وہ کافر ہکا بکا ہو کر رہ گیا۔ اور اللہ ظالم
قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔ یا تم نے اس شخص کے حال پر نظر کی جو ایک بستی
پر سے گذرا۔ اور وہ اپنی چھتوں پر ڈھی پڑی تھی کہا کیسے اللہ اسکو زندہ
کردیگا اس کی موت کے بعد۔ تو اللہ نے اسکو سو برس
تک مردہ رکھا، پھر اسکو جلا اٹھایا۔ اور پوچھا تم (اس
حالت میں) کتنی مدت رہے؟ بولا ایک دن رہا ہونگا
یا ایک دن سے بھی کم۔ فرمایا بلکہ تم سو برس رہے ہو
اپنے کھانے اور پینے کی چیزوں کی طرف دیکھو کہ
کوئی بو تک نہیں اور اپنے گدھے کی طرف دیکھو۔
(اور ہم نے ایسا اس لئے کیا کہ تم کو یقین حاصل ہو)
اور ہم تمکو لوگوں کے لئے نشانی بنا دیں اور ہڈیوں کی
طرف دیکھو کیسے ہم ان کو جوڑتے ہیں، اور پھر ان پر گوشت
چڑھاتے ہیں۔ پس جب اس پر حقیقت ظاہر ہوگئی بولا،
میں یقین کرتا ہوں کہ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔
اور یاد کرو جب ابراہیم نے کہا اے رب مجھے دکھا دے کیسے
تو مردوں کو زندہ کرے گا۔ کہا کیا تم کو اس کا یقین
نہیں؟ کہا ہاں یقین ہے لیکن تاکہ میرا قلب مطمئن
ہو جائے۔ فرمایا تو چار پرند لو، اور انھیں اپنے سے ہلا لو
پھر کرو ہر پہاڑ پر ان میں سے ایک ٹکڑا پھر ان کو

يَأْتِيْنَكَ سَعْيًا، وَاعْلَمْ اَنَّ — بلاؤ وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے اور

اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ — یقین کرو کہ اللہ عزیز و حکیم ہے ۔

یہاں اُن واقعات کی توضیح وتاویل مقصود نہیں ہے جنکی طرف یہ آیات اشارہ کر رہی ہیں ہم صرف اس حقیقت کو معلوم کرنا چاہتے ہیں جو ان آیات کے اندر مضمر ہے اور جس کی طرف نظم کلام رہنمائی کر رہا ہے۔ یہ آیتیں ماسبق آیت "اللہ ولی الذین آمنوا" الایہ کے بعد ہی وارد ہیں اُنمیں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ کون لوگ ہیں جو تاریکی سے روشنی کی طرف آتے ہیں اور کون لوگ ہیں جو روشنی سے تاریکی کی طرف جاتے ہیں۔ پس نظم اور اسلوب کلام الم ترالی الذی حاج ابراہیمؑ (کیا تم نے اس کے معاملہ پر نظر نہیں کی جس نے ابراہیم سے جھگڑا کیا) دونوں مقتضی ہیں کہ ان آیات کا تعلق ماسبق آیت سے ہو پھر جب ہم ان آیات کے مضمون پر نگاہ ڈالتے ہیں تو معاملہ بالکل صاف ہو جاتا ہے کہ آیت ماسبق میں جس بات کو اجمال کے ساتھ بیان فرمایا تھا ان آیات میں اسی کو پوری وضاحت اور تمثیل کے ساتھ سمجھا دیا ہے کہ کس قسم کے لوگ ہیں جو خدا کی روشنی سے محروم رہتے ہیں اور کون لوگ ہیں جو اس کی ہدایت سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ اب آؤ، ان آیات کو اچھی طرح تحلیل کرکے سمجھیں۔ ان میں غور کرنے سے تین شخصوں کا بیان معلوم ہوتا ہے۔

(۱) ایک وہ شخص ہے، جو حکومت و دولت اور ملک و سلطنت کے نشہ سے مخبوط ہے حضرت ابراہیمؑ نے اس کے سامنے اللہ کی روشنی پیش کی تھی لیکن وہ غرور کی بدمستی میں کسی بات پر غور نہیں کرنا چاہتا۔ حضرت ابراہیم کی بات پر فوراً معارضہ کر بیٹھتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے معارضہ کا نہایت معقول جواب دیتے ہیں۔ وہ ان کے جواب سے لاجواب ہو جاتا ہے "فبہت الذی کفر" لیکن اس پر ایمان وہدایت کی راہ نہیں کھلتی کیونکہ اللہ تعالیٰ کی روشنی طلبگاروں اور ڈھونڈھنے والوں کے لئے ہے، جو اس سے معارضہ کرتے ہیں ان کی آنکھیں اس سے چندھیا جاتی ہیں لیکن اس سے ان پر ایمان

کی راہ باز نہیں ہوتی ۔ واللہ لا یہدی القوم الظالمین ۔

(۲) دوسرا ایک شخص ہے جو علم و ایمان سے محروم نہیں ہے بلکہ یقین و بصیرت کا طلبگار ہے ۔ اور ہر وقت علم کی طلب اور حقیقت کی کھوج میں سرگرداں ۔ وہ بستیوں، مدرسوں، مسجدوں، اور خانقاہوں میں مباحثے اور مناظرے کی مجالس نہیں منعقد کرتا اور نہ یہ کرتا کہ جو خطرہ دل میں گذر جائے اس کو جھٹ چند ورقوں میں چھاپ کے، ساری دنیا میں کوس لمن الملک بجاتا پھرے، بلکہ سوچنے والے دماغ اور غور کرنے والی طبیعت کی طرح وہ خلوت کے گوشوں اور تنہائی کے ویرانوں کا شائق ہوتا ہے۔ وہ بستیوں کے ہجوم سے بھاگتا اور شہروں کے ازدحام سے گھبراتا ہے اور چاہتا ہے کہ کسی مقام عبرت و موعظت کا کوئی خلوتکدہ میسر آجائے تو اپنے ان سوالوں کو لیکر بیٹھ جائے جن کے جواب کے لئے وہ ہمہ وقت تشنہ و بیقرار ہے چنانچہ اسی طرح کی کسی ڈھئی ہوئی بستی پر اس کا گذر ہو جاتا ہے۔ اس کی منہدم دیواریں، اسکے ٹوٹے ہوئے در، اس کی سربسجود محرابیں، اس کی پراگندہ اینٹیں، اور اس کی وحشت و ویرانی کی خاموشی اس کے سامنے عبرتوں اور بصیرتوں کا ایک دفتر کھول دیتی ہے۔ اور طبیعت کا ذوق فوراً اپنے لئے فکر و نظر کا موضوع تلاش کر لیتا ہے اور جس سوال پر دماغ بار بار زور آزمائی کر کے عاجز آچکا تھا، لیکن کوئی تشفی بخش حاصل نہ پا سکا تھا، موقع و ماحول کی تاثیر سے دل کا وہی داغ پھر ابھر آتا ہے ۔ تذبذب کی خلش اور اضطراب کی چبھن پھر تازہ ہو جاتی ہے ۔ اور وہ انکار و جحود کے غرور کے ساتھ نہیں بلکہ استعظام و تعجب کی حیرانی و درماندگی کے ساتھ، اعراض و تکذیب کے نشہ سے مخمور ہو کر نہیں، یکسر ذوق جستجو اور شوق و آرزو ہو کر۔ پکار اٹھتا ہے "انی یحیی ہذہ اللہ بعد موتہا"! یہ کیسے ہوگا کہ خدا اس کو پھر زندہ کرے گا!

اگرچہ سوال وہی ہے جو مکہ کے مغروروں اور طائف کے سرکشوں نے کیا تھا اور جس کے جواب میں قرآن نے ان کو صرف جھڑکی سنائی تھی۔ لیکن سوال کے باطن کی ذہنیت بالکل مختلف ہے، وہاں انکار کا گھمنڈ تھا، یہاں تواضع کی مسکینی ہے، وہاں مناظرہ و مجادلہ کا ولولہ تھا، یہاں سوال کی خلش اور اضطراب

کی چبھن ہے۔ وہاں حریف کو چپ کرنے کی خواہش کارفرما تھی، یہاں درمان درد اور مرہم زخم مطلوب ہے۔ یعنی وہ تکذیب ہے۔ یہ سوال، وہ انکار ہے۔ یہ شک، وہ دشمنان تھا۔

چنانچہ اس شخص کے ساتھ بالکل مختلف معاملہ ہوتا ہے۔ اس کے شک کے ازالے کے لئے اسباب کے تمام پردے ہٹا دئے جاتے ہیں اور ایک ایسی صورت حالات سامنے آجاتی ہے جو شک کے ایک ایک کانٹے کو چن چن کے نکال دیتی ہے اور وہ پورے یقین کی روشنی سے معمور ہو کر پکار اٹھتا ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ فلما تبین لہ قال اعلم ان اللہ علیٰ کل شئ قدیر۔

۳۔ اس کے بعد تیسرے شخص حضرت ابراہیم علیہ السلام نمودار ہوتے ہیں۔ یہ فرماتے ہیں، اے پروردگار! تو مجھے دکھا دے کہ تو مردوں کو کیسے زندہ اٹھا کھڑا کرے گا! سوال ہوتا ہے کہ کیا تم کو اس پر ایمان ویقین نہیں ہے؟ فرماتے ہیں، ایمان ویقین تو ہے۔ بھلا ایمان ویقین کیوں نہ ہوگا! تیرے علم و قدرت سے کیا بعید ہے! تو تو سب کچھ کر سکتا ہے! لیکن اے رب میں ایمان ویقین سے کچھ زیادہ چاہتا ہوں، میں شرح صدر کا بھوکا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ انوار بصیرت کے دریا میں ڈوب جاؤں، میرا سینہ آفتاب یقین و طمانیت کا ایک ابدی و دائمی مطلع بنجائے۔ میں جو کچھ بصیرت سے سمجھا ہوں، اس کو بصارت سے دیکھ لوں، اس کی معرفت میں غرق ہو جاؤں، اس کے رنگ میں رنگ جاؤں۔ لیطمئن قلبی

یہ حالت، اوپر کی دونوں حالتوں سے مختلف ہے۔ یہ نہ تو انکار و جحود کی حالت ہے، نہ شک و اضطراب کی۔ یہ شرح صدر کی طلب ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ایسا معاملہ کرتا ہے کہ ان کا دل اطمینان ویقین کی دولت سے مالامال ہو جاتا ہے اور ان کی بصیرت کے سامنے سے تمام حجابات یکقلم ہٹ جاتے ہیں۔

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ یہ تین شخص درحقیقت تین جماعتوں کے نمایندے ہیں۔ اور خدا کی روشنی ان تینوں جماعتوں کے ساتھ تین مختلف قسم کے معاملے کرتی ہے۔ ایک جماعت منکرین مجادلین کی ہے۔ ان کی نگاہوں کو نور الٰہی صرف خیرہ کر دیتا ہے۔ ایمان و بصیرت نہیں بخشتا

دوسری جماعت ارباب شک و اضطراب کی ہے۔ خدا کی روشنی ان کو تشفی و طمانیت بخشتی ہے تیسری جماعت طالبین شرح صدر کی ہے، اللہ تعالیٰ ان کے سینوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔

یہ عام سنۃ اللہ کا بیان ہے۔ شقاوت و سعادت کا وہ قانون جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، یہی ہے۔ اور بالکل ٹھیک ٹھیک یہی حالت قرآن مجید کے فکر و تدبر میں ایک طالب قرآن کو پیش آتی ہے۔ اگر ایک شخص قرآن مجید سے حجت کرنا چاہے، اور یہ حوصلہ لے کر اٹھے کہ اس کی دلیلوں سے لڑائی لڑے گا اور اس کی نصیحتوں سے جھگڑے گا تو اللہ تعالیٰ اس پر قرآنی ہدایت کا دروازہ بند کر دیتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص ایسا ہے جو کسی شک و شبہ کی خلش سے بے چین ہے اور چاہتا ہے کہ قرآن اس کے شبہات دور کر دے، تو قرآن اس کی رہبری کرتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ اس کو یقین و بصیرت کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ اس معاملہ میں قرآن مجید کی روش ایک طبیب کی ہے، اگر کوئی طالب شفا اس کے پاس اس لئے آئے کہ اس کی بیماریاں دور ہو جائیں تو وہ چونکہ شفاء لما فی الصدور دل کے تمام روگوں اور بیماریوں کی دوا ہے، وہ اس کے لئے شفا پہنچاتا ہے، لیکن اگر کوئی مریض اس لئے آتا ہے کہ وہ طبیب کے مشوروں کو سننے اور سمجھنے کی بجائے اس سے معارضہ کرے گا، یا اس کی باتوں کو اپنی خواہشوں کے موافق بنانے کی کوشش کرے گا، تو اس کی بیماری دور ہونے کی جگہ بڑھتی اور گھٹنے کے بجائے زیادہ ہوتی ہے۔ فی قلوبہم مرض فزادہم اللہ مرضا، ولہم عذاب الیم، بما کانوا یکذبون۔

قرآن مجید اور صاحب وحی علیہ الف الف تحیۃ کے ابتدائی احوال اس حقیقت کو پوری طرح کھول دینے کے لئے بالکل کافی ہیں۔ نبوت سے قبل لیکن بعثت کے قریب آنحضرت صلعم کا کیا حال تھا: ایک گمراہ اور آوارہ دنیا کے اندر جس کے اوپر اور نیچے صرف تاریکی ہی تاریکی چھائی ہوئی تھی، آپ ایک روشنی کے لئے بیقرار تھے۔ ایسی روشنی جو دنیا کے لئے ہدایت اور نجات کی بند راہوں کو کھول دے جو عقل و دل کی بصیرت کو جگمگا دے، جو شبہات کی تاریکیوں کو مٹا دے، اور اس کائنات کے معمہ کو

جس پر ہزارہا حجابات اور پردے پڑے ہوئے ہیں، حل کرکے سمجھا دے۔ آپ کو اندرونی خلشوں اور باطنی کاوشوں نے یکسر درد بنا دیا تھا۔ آپ سراپا طلب و جستجو اور سرشوق و آرزو ہو کر، بستی سے متنفر اور آبادی سے بیزار ہو گئے تھے۔ ایک صحرا کے اندر، ایک پہاڑ کے غار میں معتکف ہو کر منتظر تھے کہ کسی طرح یہ سامنے کے پردے چاک ہوں اور حقیقت منتظر جلوہ آرا ہو۔ طلب و جستجو کی یہ نیازمندی اور شوق و آرزو کی یہ فروتنی اور پھر تفکر و تدبر کی یہ خلوت گزینی اور غارنشینی تھی جب اقرأ کا پیام آیا اور خدانے ایک سر بزرا لو انسان کو اٹھایا اور اس پر امتنان فرمایا کہ " ووجدک ضالا فھدی " (ہم نے تم کو تلاش حقیقت میں سرگرداں پایا تو ہدایت بخشی)

پس طالب قرآن کی ابتدا اور انتہا، دونوں طلب و جستجو اور عجز و فروتنی ہے۔ بے نیازی، استکبار مجادلہ، معارضہ کے ساتھ اس راہ کی ایک منزل بھی طے نہیں ہو سکتی ۔ قرآن کی طرف آدمی کا قدم اس لئے اٹھنا چاہئے کہ اس کو حقیقت کی طلب ہے اور جب تک حقیقت نہ مل جائے طالب کو چاہئے کہ وہ قرآن کے اندر معتکف رہے۔ اور فکر و تدبر کا جہاد جاری رکھے۔ شبہات کتنے ہی اہم ہوں اور مشکلات کتنی ہی کٹھن، ایک لمحہ کے لئے بھی مایوس نہ ہو۔ جو شخص خلوص نیت کے ساتھ طلب علم اور جستجوئے رشد و ہدایت کی راہ میں جہاد کر رہا ہے، اس کی کامیابی یقینی ہے۔ " والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا " اس کے اطمینان و بصیرت کے لئے خدائے کارساز و کریم دشوار کو سہل بلکہ ناممکن کو ممکن کر دے گا اور اس کو ہدایت و ایمان کی غذا اس گوشہ سے ملے گی جس گوشہ سے اس کو کبھی وہم و گمان بھی نہ گذرا ہوگا۔ " یرزقہ من حیث لا یحتسب "

اور پھر اگر قرآن پر آدمی ثابت قدم رہے تو وہ نعمت عظمیٰ جس کو ہم نے شرح صدر سے تعبیر کیا ہے اور جس کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواہش کی تھی، وہ بھی اس کو ملتی ہے، چنانچہ قرآنی تعلیمات کے ظہور و کمال کے بعد اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم سے فرمایا۔ " الم نشرح لک صدرک

کیا ہم نے تمہارے سینہ کو کھول نہیں دیا۔

اس سلسلہ کی ایک نہایت لطیف حقیقت سورہ مجادلہ میں بھی بیان ہوئی ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے دو جماعتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ ایک جماعت کا حال یہ ہے کہ جب دینی احوال و معاملات میں اس کو کوئی مشکل، دشواری، شبہہ، یا روکاوٹ پیش آتی ہے تو خدا سے مجادلہ اور رسول سے شکوہ کرتی ہے۔ مجادلہ عربی زبان میں اس اصرار و الحاح کو بھی کہتے ہیں جس کی بنیاد محبت، اعتماد اور خلوص پر ہو۔ یعنی وہ خدا و رسول پر اعتراض یا نکتہ چینی نہیں کرتی اور نہ قرآن و حدیث کا مذاق اڑاتی بلکہ اپنے شبہات و شکوک، محبت و اعتماد کے ساتھ عرض کرتی ہے، اور ان کا حل چاہتی ہے۔ اور دوسری جماعت وہ ہے جس کی خصوصیت محادّہ ہے۔ محادۃ کے معنی اختلاف کے ہیں۔ یعنی ان کی اصلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ خدا اور رسول کی مخالفت اور ان کی باتوں پر طرح طرح کی نکتہ چینیاں اور قسم قسم کے شبہات وارد کرے۔ پہلی جماعت کی نمائندہ ایک عورت ہے، جو ایک خصوص دینی معاملہ کی وجہ سے سخت کشمکش میں پڑ گئی ہے۔ لیکن بجائے اسکے کہ وہ اس کشمکش کو مذہب پر زبان درازی کا بہانہ بنائے، اپنی مشکل کو نہایت لجاجت اور عاجزی کے ساتھ خدا و رسول کے حضور میں عرض کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی عرض کو سنتا ہے اور اس کی مشکل کو دور کر دیتا ہے۔ "قد سمع اللہ قول التی تجادلک فی زوجہا و تشتکی الی اللہ، واللہ یسمع تحاورکما، ان اللہ سمیع بصیر۔" دوسری جماعت منافقین کی ہے ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اس گھات میں رہتے ہیں کہ کوئی موقع اعتراض اور نکتہ چینی کا پائیں اور اس کو لے اڑیں۔ ان کی نسبت فرمایا۔ ان الذین یحادون اللہ ورسولہ کبتوا کما کبت الذین من قبلہم وقد انزلنا بینات وللکفرین عذاب مہین۔ سورہ مجادلہ کے اندر ان دونوں جماعتوں کا ذکر دو مقابل جماعتوں کی حیثیت سے آیا ہے اور اس کا مقصود محض لوگوں کو اس بات کی تعلیم دینا ہے کہ خدا اور رسول کے ساتھ معاملہ کرنے کا طریقہ عرض و معروض اور شکوہ

التجا ہے۔ نہ کہ محادہ اور مناقشہ۔ پس خدا کے دین یا اس کی کتاب میں اگر کوئی اشکل پیش آئے تو اس کی راہ صرف یہی ہے کہ اس کو خدا ہی کے سامنے پیش کرے اور اسی سے تسلی و تشفی اور فتح باب کا متمنی ہو۔ یہ نہ کرے کہ جھٹ اس کو ذریعہ اعتراض و نکتہ چینی بنا کر ایک نیا دین کھڑا کر دے، یا تراش خراش کر اپنی خواہشوں کے سانچے میں ڈھال لے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں ان پر قرآن کی راہ کبھی نہیں کھلتی۔ وہ یا تو کتاب الٰہی پر نکتہ چینی کرتے کرتے اس سے اسقدر ابعد ہو جاتے ہیں کہ پھر اسکی طرف لوٹنے کا ان کے لئے امکان ہی نہیں باقی رہ جاتا۔ یا قرآنی آیات کی تراش خراش کے معاملہ میں اسقدر چابکدست ہو جاتے ہیں کہ آہستہ آہستہ قرآن کی ہر بات کو اپنی خواہشوں کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ اور ان پر بالکل وہ حالت طاری ہو جاتی ہے جو یہود پر طاری ہو چکی تھی۔ "ومنہم امیون لایعلمون الکتاب الا امانی"

قرآن مجید ایک اعلیٰ کلام ہے

"جو لوگ قرآن کو ایک معمولی کلام خیال کرتے ہیں، اور اپنی لیاقت کو جتنی ہے، اس سے زیادہ سمجھکر سمجھتے ہیں کہ یہ فہم قرآن کے لئے کافی ہے، وہ قرآن کے معنی سے بالکل محروم رہتے ہیں ان میں سے بعض اپنی کج فہمی کا نام اعتراض رکھتے ہیں۔ دوسرے مذاہب والے جو قرآن کو کچھ تھوڑا بہت سمجھتے ہیں، وہ خود گواہی دیتے ہیں کہ اس کو سمجھنے کے لئے یہ پہلا امر ہے کہ اسے ایک اعلیٰ کلام مانا جاوے۔

قرآن پاک نے اپنی نسبت مختلف جگہ یہی کہا ہے کہ انکار کرنے والا اس کو ہرگز نہیں سمجھے گا۔"

(فراہیؒ)

مذاکرہ

نظر بر استدراک

(از جناب چودھری غلام احمد پرویز بی۔ اے)

الاصلاح بابت اپریل میں میرا مضمون بعنوان نجات شائع ہوا۔ جس پر مدیر الاصلاح کا یہ نوٹ دیکھکر کہ وہ اس کے اختلافی مقامات کے متعلق آئندہ پرچہ میں اپنی تصریحات درج فرمائیں گے مجھے خوشی ہوئی کہ ایک ایسے نظریئے کے متعلق، جسے میں سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلی مرتبہ میں نے ہی پیش کیا ہے (یعنی نجات کا ارتقائی تخیل) مجھے معلوم ہو سکے گا کہ قرآن کریم کا صحیح مفہوم سمجھنے میں میں کہاں کہاں قاصر رہا ہوں۔ لیکن جب مئی اور جون کے پرچوں میں مولوی اختر احسن صاحب کا استدراک دیکھا تو میں بھی ایسا ہی مایوس ہوا جیسے خود مدیر الاصلاح اور غالباً الاصلاح کے اور پڑھنے والے۔ مدیر الاصلاح نے تو اپنی مایوسی کو اختصار اور ابہام کے تبسم میں چھپانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہر صاحب نظر کے سامنے بے نقاب ہو کہ استدراک یا تو محض اس غرض سے لکھا گیا ہے کہ میرے مضمون کے خلاف کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری تھا یا مولوی صاحب جو کچھ لکھنا چاہتے تھے وہ لکھ نہیں سکے۔ بہر حال ان کی تحریر میں کچھ ایسا الجھاؤ ہے کہ ان کا مفہوم سامنے آتا ہی نہیں۔ استدراک میں کسی اصولی بات سے بحث ہی نہیں کی گئی اس لئے اس کے جواب میں مجھے کچھ لکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اس میں دو ایک باتیں ایسی آگئی ہیں کہ ان کے جواب میں؎ اگر خاموش بنشینم گناہ است۔

لہذا یہ چند سطور توضیحاً لکھ رہا ہوں۔

میرے مضمون کا عمود یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے یہ کہیں ثابت نہیں کہ کوئی شخص جہنم میں داخل

ہونے کے بعد پھر اس سے نکالکر جنت میں بھیجا جائے گا اور اس کو میں نے قرآن کریم کی روشنی میں عین اصولِ فطرت کے مطابق دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اسی لئے میں نے لکھا تھا کہ اس قسم کی نجات کا تخیل جسکی رو سے جہنم کے عذاب میں داخل ہوکر پھر اس سے رہائی ملنے کی طرف ذہن منتقل ہو، یکسر غیر قرآنی ہے۔ اس کے علاوہ، دنیاوی مصائب میں گرفتار ہوکر ان سے آزادی ملنے کے لئے، یا عذاب دوزخ سے (بغیر اس میں داخل ہوئے) محفوظ رہنے کے لئے، نجات کے لفظ کے استعمال کے لئے مجھے کوئی اعتراض نہ تھا۔ اور یہ میرے مضمون سے بالکل واضح تھا۔

لیکن مولوی صاحب نے، باوجود اختصار کے عادی ہونے کے، پانچ چھ صفحے اس بات کے ثابت کرنے میں صرف کردیئے کہ نجات کا لفظ مصائب دنیاوی سے بچنے، یا عذاب جہنم سے (بغیر اس میں داخل ہوئے) محفوظ رہنے کے لئے اگر استعمال کیا جائے تو یہ مفہوم غیر قرآنی نہیں ہے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ مولوی صاحب نے اتنا کچھ لکھکر میری کس غلطی کو واضح کیا۔ اس کا تو مجھے پہلے ہی اقرار ہے۔ پھر اس سے ثابت کیا ہوا۔ یا تو مولوی صاحب نے (معاف بفرمایند) میرا مضمون سمجھا ہی نہیں، یا جو کچھ وہ کہنا چاہتے وہ کہہ نہیں سکے۔

دوسرا اعتراض اس آیت کے مفہوم کے متعلق ہے۔ " وان منکم الا واردھا کان علیٰ ربک حتماً مقضیا ثم ننجی الذین اتقوا و نذر الظالمین فیھا جثیا "۔ اس کے متعلق انھوں نے فرمایا ہے کہ وُرُود کے معنی دخول کے ہیں۔ اور میں نے جو اس کے معنی "اوپر سے گذرنے" کے دئے ہیں۔ یہ بالکل غلط ہیں۔ لیکن میں یہ گذارش کروں گا کہ یہ معنی میں نے وضع نہیں کئے بلکہ یہ معنی شاہ رفیع الدینؒ نے اپنے ترجمے میں لکھے ہیں۔ اور پھر وُرُود بمعنی قُرب خود مولوی صاحب نے بھی قرآن کریم سے ثابت کیا ہے تو اب معلوم نہیں میں نے کونسا جرم کردیا۔ حیرت ہے کہ اگر کوئی شخص اسلاف کے متعین کردہ معانی کے خلاف لب کشائی کرے تو مجرم۔ اور اگر انھی کے معانی استعمال کرے تو جرم۔ غرض دوگونہ عذاب است جان مجنون را۔

استدراک کے اس حصہ میں بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ مولوی صاحب کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اولاً تو آپ فرماتے ہیں کہ "ہمارے نزدیک اس آیت کو اس مضمون سے کوئی تعلق نہیں"۔ معاملہ صاف ہو گیا۔ میں نے تو اس آیت کو اس لئے نقل کر دیا تھا کہ کوئی صاحب اس سے دخول جہنم کے بعد نجات کا مفہوم نہ اخذ کر لیں۔ اب جب آپکے نزدیک اس آیت کا اس مضمون سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے تو اس کو معرض بحث میں لانیکی کیا ضرورت۔

پھر ارشاد ہے کہ میری تاویل "عین اس حدیث کے مطابق ہے جس میں پل صراط کا ذکر ہے"۔ میرا خیال تھا کہ مولوی صاحب کیلئے میری تاویل کی حجت کی سند اس سے بڑھکر اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ ایک حدیث کے عین مطابق ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات حدیث کی حجیت کے بھی اسیوقت تک قائل ہیں جب تک وہ اپنے مزعومہ عقیدہ کے مطابق ہو۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ "لیکن آیت کے الفاظ پر غور کر کے دیکھنا چاہئے کہ آیت کی یہ تاویل ہو بھی سکتی ہے یا نہیں"۔ اور پھر دو تین صفحات کے اندر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ تاویل غلط ہے۔ یہ لکھتے وقت مولوی صاحب نے شاید اتنا نہیں سوچا کہ تیرے نشتر کی زد شریان قیس ناتواں تک ہے۔ آپ پرویز کی تاویل کی مخالفت کرتے کرتے خود حدیث کی مخالفت کر گئے ہیں۔ یہ نادان کی دوستی نہیں تو اور کیا ہے۔

اور یہ بھی تماشا ہے کہ اس آیت کی صحیح تاویل بھی آپ بیان نہیں فرماتے حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ جب ورود کے معنی قرب کے بھی ہیں۔ اور یہ معنی لینے میں قرآن کریم کی دیگر آیات بینات کی تائید ہوتی ہو۔ تو پھر دوسرے معنی کیوں لئے جائیں۔ جنکی وجہ سے نہ صرف دوسری آیات کی ہی مخالفت ہوتی ہو بلکہ ایسے اشکال سامنے آجائیں جنکا حل مشکل ہو جائے۔ اور مقصد پھر بھی کچھ حاصل نہیں آپ فرماتے ہیں کہ قرب کے معنی لینے میں یہ اعتراض ہوتا ہے کہ دوسری جگہ جو ہے کہ جنتیوں کو دوزخ سے بہت دور رکھا جائیگا۔ اور ان کو اس کی آواز بھی سنائی نہ دیگی۔ تو ان دونوں میں تضاد واقع ہو جائے گا۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ

جب ورود کے معنی دخول کے لئے جائیں تو کیا پھر یہی نقشہ قائم نہ ہو جائے گا؟ یہ تو اور بھی شدت کا تضاد ہوگا۔ اور پھر اس کا کیا جواب ہوگا کہ قرآن کریم میں تو اہل جنت اور اہل جہنم کا باہمی مکالمہ بھی موجود ہے بہرحال اس آیت سے تو مولوی صاحب نے ثابت ہی نہیں کیا کہ دوزخ کا عذاب بھگتنے کے بعد لوگ جنت میں بھیجے جائیں گے۔ اور یہی میرا دعویٰ ہے کہ قرآن کریم سے ایسا ثابت نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد مولوی صاحب نے یہ بات ثابت کی ہے کہ خلود جہنم کفر و شرک سے ہوگا۔ کیونکہ حبط اعمال صرف کفر و شرک سے ہی ہوتا ہے۔ جس میں ایمان ہوگا۔ اس کے لئے حبط اعمال نہیں ہے۔ لہذا جب اس کے تمام اعمال غارت نہیں ہوں گے تو ان کی جزا کے لئے دوزخ سے نکال کر جنت میں لے جانا ضروری ہوگا۔

غنیمت ہے کہ مولوی صاحب نے اتنا تو مان لیا کہ کافر و مشرک کے لئے خلود جہنم ہوگا۔ اور اس کو وہ اہل سنت والجماعت کا مذہب بیان فرماتے ہیں۔ لیکن اگر کسی اہل سنت والجماعت نے یہ کہہ دیا کہ نا صاحب۔ ہمارا تو یہ مذہب ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ فرشتے دوزخ کے دروازے کھٹکھٹائیں گے اور اس میں کوئی موجود نہ ہوگا۔ (یعنی دوزخ موجود ہوگا اور اس کے اندر کوئی نہ ہوگا۔) تو پتہ نہیں آپ اس کا کیا جواب دیں گے۔

لیکن مولوی صاحب نے جو صغریٰ و کبریٰ قائم کیا ہے وہ از خود غلط ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ

خلود جہنم حبط اعمال سے ہوگا۔

اور حبط اعمال ہوتا ہے کفر و شرک سے

اس لئے

خلود جہنم صرف مشرک و کافر کے لئے ہی ہے

اور چونکہ مومن کے لئے حبط اعمال نہیں۔ اس لئے اس کے لئے خلود جہنم نہیں

لیکن قرآن کریم میں تو یہ بھی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا اے لوگو جو ایمان لائے ہو مت بلند کرو آواز اپنی کو

اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ	اوپر آواز نبی کے۔ اور مت آواز بلند کرو اوپر اس کے بیچ
وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ	بول کے جیسا بلند کرتے ہیں بعضے تمہارے واسطے بعض کے
بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ	ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال برباد ہو جائیں اور
وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (۲:۴۹)	تم کو خبر بھی نہ ہو۔

یہاں خطاب اہل ایمان سے ہے اور حبط اعمال کفر و شرک سے نہیں بلکہ نبی کی آواز سے اپنی آواز بلند کرنے سے ہے۔ اور حبب خلود جہنم حبط اعمال سے ہی ہے تو ظاہر ہے کہ ایسے مسلمانوں کے لئے بھی خلود جہنم ہوگا۔ لیجئے، مولوی صاحب کی تمام خود ساختہ عمارت دھڑام سے گر پڑی۔ اس لئے کہ اس کی بنیادیں یکسر قیاس آرائی پر تھیں، قرآن کریم پر نہ تھیں۔

پھر ایک اور دلچسپ صغریٰ کبریٰ قائم فرماتے ہیں۔ رشاد ہے کہ چونکہ خدا کا یہ قانون صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے کہ "من یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہٗ"۔ تو سزا کا ہونا ضروری ہے۔ اور پھر خود ہی لکھتے ہیں کہ "البتہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہر گناہ کی سزا ہونی چاہئے"۔ اللہ اکبر! ایک طرف تو خدا کا یہ قانون ایسا اٹل ہو کہ ذرہ برابر برائی کی بھی سزا ہو۔ اور دوسری طرف مولوی صاحب کا فیا سر ملاحظہ ہو کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر گناہ کی سزا ہونی چاہئے۔ یہاں پھر مولوی صاحب الجھن میں پھنس گئے۔ قرآن کریم کی رو سے صحیح مسلک یہی ہے کہ جن لوگوں کو جنتی زندگی کا مستحق سمجھا جائے گا ان کی لغزشیں معاف کر دی جائیں گی۔ نکفر عنہم سیاٰتہم، اور جن کو جہنم کی زندگی کے لائق سمجھا جائے گا، ان کے لئے حبط اعمال ہوگا اسلئے کہ جنت دوزخ میں جانیکا کا معیار ثقل و خفت موازنہ ہے۔ اور یہ وہ آیت ہے جسے مولوی صاحب نے چھوا تک نہیں۔

پھر یہ بھی غلطی ہے کہ مولوی صاحب دخول جہنم اور خلود جہنم میں فرق سمجھ رہے ہیں۔ اور خلود جہنم والوں کا الگ ذکر فرماتے ہیں۔ حالانکہ میں نے اپنے مضمون میں ثابت کیا ہے کہ تنہا خلود (خالدین فیہا) کے معنی۔ بغیر خالدین فیہا ابداً کے۔ بھی ہمیشگی اور "خلود" کے ہیں۔ اسکی طرف بھی مولوی صاحب نے توجہ نہیں

فرمائی۔

مولوی صاحب کو اعراف کی تیسری جماعت پر بھی اعتراض ہے۔ حالانکہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جنکی نیکیوں اور برائیوں کے پلڑے مساوی ہوں گے جن کی قسمت کا فیصلہ میزان نے نہیں کیا، ان کا معاملہ زیر غور ہوگا۔ اور خدا کی رحمت سے توقع ہے کہ وہ جنت میں جائیں گے۔ پتہ نہیں اس مقام پر مولوی اسلم صاحب کا ذکر بالکل بے محل کیوں آگیا۔ اللہ تعالیٰ جب کسی کی ذہنیت کو بے نقاب کرنا چاہتا ہے تو اس کے ہاتھوں سے ایسی ہی باتیں لکھنے میں آتی ہیں۔ اب آخیر میں مولوی صاحب کی قرآن فہمی کی بھی ایک مثال دیکھتے جایئے۔ یہ حضرات دوسروں کو مطعون کرتے رہتے ہیں کہ انھیں قرآن کے اصولوں سے واقفیت نہیں اس لئے یہ غلطیاں کرتے ہیں۔ لیکن اگر اصول قرآن سے واقفیت کے بعد قرآن ایسا ہی سمجھ میں آتا ہے تو اس سے تو وہ ناواقفیت اچھی جس سے صحیح قرآن سمجھ میں آجائے۔ میں نے لکھا تھا کہ بچوں کا ذکر جنت میں نہیں ہے۔ کیونکہ جنت اعمال کی وراثت ہے۔ آپنے اس کے خلاف یہ آیت نقل فرمائی ہے۔ "والذین آمنوا واتبعتھم ذریتھم بایمان الحقنا بھم ذریتھم وما التناھم من عملھم من شیٔ"۔ اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بچے جنت میں ضرور جائیں گے۔ اول تو اس آیت میں انھوں نے ذریت کے معنی اولاد لکھے ہیں۔ حالانکہ ذریت کے معنی اولاد۔ اور اولاد در اولاد ہے۔ پھر آیت میں اس ذریت کی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ ایمان لائے ہیں۔ انھوں نے اتباع کی ہے۔ اور یہ کہ ان کے اعمال میں اللہ کمی نہ کرے گا۔ اس سے نابالغ غیر مکلف بچے کسطرح مراد لئے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس سے عجیب تر ایک اور استدلال ملاحظہ فرمایئے۔ فرماتے ہیں کہ "بہشت میں جو آرزو کی جائے گی پوری ہوگی...... اس لئے اللہ تعالیٰ مومنین کی اس آرزو کو کہ ان کی اولاد ان کے ساتھ کردی جائے۔ انکی تکمیل مسرت کیلئے پوری کردے گا"۔ کیا عمدہ استدلال ہے۔ اور اگر کسی کی وہاں یہ آرزو ہو کہ اس کے فلاں دوست یا اسکی بیوی کو تکمیل مسرت کے لیئے اس کے ساتھ کردیا جائے۔ تو ان سب کو دوزخ سے نکال کر جنت میں پہنچا

جائے گا! یہ دستہ بڑا عمدہ رہا۔ ایک شخص جنت میں چلا گیا اور اس نے تلا بھر کو وہاں بلا بھیجا۔ کہ اس کی تکمیل مسرت اس سے ہوگی۔

اس کا نام یہ حضرات رکھتے ہیں اصولِ دلالت قرآن :

اخیر میں مولوی صاحب نے یہ آیت نقل فرمائی ہے" انکم وما تعبدون من دون اللہ حصب جہنم..... اور ما تعبدون کا ترجمہ کیا ہے" تمھارے اصنام" محض اسلئے کہ وقودھا الناس والحجارہ میں جو حجارہ سے انھوں نے اصنام مراد لئے ہیں۔ اس کی تائید ہو جائے۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ ما تعبدون اس سے کہیں وسیع تر ہے۔ دوزخ میں جو متبوعین اور متبعین کے باہمی جھگڑے ہیں۔ وہ کیا سب پتھر کے بتوں سے ہی ہوں گے!

میں نے شروع میں جو عرض کیا ہے کہ یہ استدراک محض اس لئے لکھا گیا ہے کہ ایک ایسے مضمون کے خلاف جس میں خلودِ جہنم کا ثبوت دیا گیا ہو، کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری تھا۔ وہ تصریحات بالا سے ظاہر ہے۔ ورنہ مولوی صاحب نے خود اقرار کیا ہے کہ

"یہ صحیح ہے کہ قرآن کریم میں کوئی ایسی صریح آیت نہیں ہے جس سے سزا کے بعد جنت میں داخل ہونا ثابت ہو" اور یہی میرا دعویٰ تھا۔

میں ان حضرات کی خدمت میں بادب گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے ہر چند اصولِ دلالت، نظم و ربط و ضبط سب ضروری ہیں۔ لیکن ان سب سے مقدم ایک اور شے ہے اور وہ یہ کہ ذہن کو ان عقائد سے پہلے خالی کر لیا جائے جو روایتی اور اجماعی مسلک کی شکل میں دماغ میں موجود ہوں۔ اس کے بعد قرآن کو کھولئے تو انشاءاللہ صحیح راہ مل جائے گی۔ مثلاً اسی مضمون کو لیجئے۔ مولوی صاحب اور ان کے رفقاء اسی کوشش میں رہے کہ خلودِ جہنم چونکہ ان کے روایتی (یا اجماعی) عقیدہ کے خلاف ہے۔ اس لئے اس کے خلاف کچھ نہ کچھ ضرور لکھا جائے۔ اور وہ حضرات جنھوں نے خالی الذہن ہو کر اس کا مطالعہ کیا انھوں نے اس حقیقت کو بے نقاب دیکھ لیا کہ قرآنی نجات کا نظریہ کس طرح عین اصول فطرت کے

مطابق اور انسان کے ارتقائی منازل طے کرنے کا نام ہے میں نے اسی لئے محترمی مولوی امین احسن صاحب سے گذارش کیا تھا کہ وہ میرے اس مضمون کو نہ لیں[۵۱] کیونکہ اعظم گڈھ اور اس کے متعلقات اس کے متحمل نہیں ہو سکیں گے۔ لیکن وہ اسے باہر اڑے لے گئے اور خواہ مخواہ "دوگونہ عذاب" میں پھنس گئے۔

میں تو ابھی منتظر ہوں کہ کوئی صاحب قرآن کی رو سے میری غلطی کو واضح کر دیں۔ اگر وہ غلطی ہے تو۔ اور یہ نظریہ درست ہے۔ تو "ربنا لاتزغ قلوبنا بعد اذ ہدیتنا۔

---

۵۱ الاصلاح یہ بات بالکل خلاف واقعہ ہے۔ یہ مضمون مجھکو مولانا اسلم نے اس وقت عنایت فرمایا تھا جب میں دہلی سے واپس ہو رہا تھا۔ سفر کی رواروی میں میں اس کو پورا پڑھ نہ سکا۔ یہاں آکر پڑھا تو مجھکو اس میں بعض غلطیاں نظر آئیں۔ میں نے پرویز صاحب کو اور غالباً مولانا اسلم صاحب کو بھی لکھا کہ مجھے اس مضمون کے بعض حصوں سے اختلاف ہے۔ اگر وہ اجازت دیں تو میں اس پر نوٹ لکھکر شائع کر دوں ورنہ مضمون واپس کر دوں، مولانا اسلم صاحب نے لکھا کہ مناسب یہ ہے کہ اس کو بعینہ شائع کر دو اور اپنی رائے علٰحدہ مضمون میں ظاہر کر دو، مجھکو اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آئی اور یہی شکل اختیار کر لی گئی۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو صورت معاملہ یہی ہے۔ اور میں پورے اطمینان کے ساتھ محسوس کر رہا ہوں کہ اس مضمون کی وجہ سے نہ تو "اعظم گڈھ اور اس کے متعلقات" کو کوئی زحمت پیش آئی اور نہ میں کسی "دوگونہ رنج و عذاب" میں پھنسا۔ دنیا کا کارخانہ اپنے معمول کے مطابق چل رہا ہے۔ اور ہم سب ہمیشہ کی طرح پرویز صاحب کے اس مضمون کے بعد بھی بالکل خوش اور مطمئن ہیں۔

ہاں۔ پرویز صاحب کی اس تحریر کو پڑھنے کے بعد یہ محسوس کر کے ضرور تھوڑا سا رنج ہوا کہ مولوی اختر احسن صاحب کا مضمون ان کی آزردگی کا باعث بنا۔ اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ان کو بالکل پہلی مرتبہ ایک نئی حالت سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ ان کی تحریریں اخباروں اور رسالوں میں چھپ جایا کرتی

نہیں، لوگ پڑھ لیتے تھے، وہ خوش ہو جایا کرتے تھے۔ اب تک تسوید و تحریر کی دنیا کا صرف یہی خوبصورت پہلوان کے سامنے تھا۔ ان کو بالکل خبر نہیں تھی کہ اس دنیا کا ایک اور رخ بھی ہے جو دلکش اور دلفریب نہیں ہے بلکہ کسی قدر بھیانک ہے اور وہی اس کا اصلی چہرہ ہے۔ اور ہر اس شخص کو جس نے قرطاس و قلم کا مشغلہ اختیار کیا ہو بالآخر اسی بھیانک چہرہ سے عشق کرنا پڑتا ہے۔ اس کا نام "نقد و تبصرہ" ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ یہی بھیانک چہرہ، بالکل پہلی مرتبہ ان کو مولوی اختر احسن صاحب کے مضمون میں دیکھنا پڑا۔ اور وہ اس کو دیکھ کر بالکل گھبرا اٹھے۔ اور اسی گھبراہٹ کی حالت میں مضمون لکھنے بیٹھ گئے۔ حالانکہ دانشمندوں کا مشورہ یہ ہے کہ آدمی کو جب کبھی ایسی حالت پیش آجائے تو پہلے اپنی گم شدہ دلجمعی اور سکون قلب کو ڈھونڈھنے کی کوشش کرے۔ جب یہ چیز مل جائے تو معاملہ کی نوعیت پر بار بار غور کرے۔ اور پھر زبان کھولے۔ لیکن انھوں نے پرانے دانشمندوں کی اس حکمت پر عمل نہیں کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی طبیعت کی ایک ایسی حالت بے نقاب کرنے پر مجبور ہو گئے کہ ہم کو افسوس اور ندامت ہے کہ اس کی "نقاب کشائی" کی رسم افتتاح کی ذمہ داری ہم نے اپنے سر کیوں لی!

مولوی اختر احسن صاحب کا مضمون مجمل سہی، لیکن سنجیدہ، ٹھوس، اور "طالب العلمانہ" تھا۔ اس میں ایک فقرہ بھی ایسا نہ تھا جس میں استخفاف و استہزا یا تحقیر کا کوئی شائبہ ہو۔ لیکن آپ اپنی اس تحریر گرامی کو ملاحظہ فرما کر سوچئے کہ مروجہ مضمون نگاری کی وہ کونسی بلاغت ہے جس کے اسراف سے یہ آپ آپس باز رہے ہیں! مولوی اختر احسن صاحب نے آپ کو نہایت شائستہ انداز میں آپ کی غلطیوں پر متنبہ کیا تھا، آپ ان کی غلطیوں پر ان کو متنبہ کر دیتے۔ بحث ختم تھی۔ ان تعریضات و کنایات اور لن ترانیوں کے بغیر کونسا کام بند تھا! اور اگر آپ حضرات کے نزدیک ان چیزوں کے بغیر مضمون نگاری کا فرض ادا نہیں ہوتا تو آخر کیوں فرض کر لیا گیا ہے کہ ہر شخص اس نازک ذمہ داری سے عہدہ برآ بھی ہو سکتا ہے!

تعجب ہے کہ آپ مولوی اختر احسن صاحب کا مضمون نہیں سمجھے۔ حالانکہ آپ چاہتے تو اس کو بآسانی سمجھ سکتے تھے۔ ہر چند صرف ایک شخص کو سمجھانے کے لئے، اور وہ بھی ایسا شخص جو آپ کی طرح سمجھنے سے بھاگنا چاہتا ہو، الاصلاح کے صفحات کو ضائع کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن ایک مرتبہ اور کوشش کی جائے گی کہ آپ سمجھ جائیں۔ لیکن خدارا ذرا قریب آیئے۔ آپ تو شاہ رفیع الدین رحمتہ اللہ علیہ کا ترجمہ کیا پا گئے ہیں گویا معارف قرآن کی کوئی آسمانی کلید ہاتھ آگئی ہے جس کے بعد آپ سے کچھ کہنے سننے کا کسی کو کوئی حق ہی باقی نہیں رہ گیا ہے!

معاف کیجئے گا، آپ لوگوں نے اپنے طرز عمل سے ان مقدس مترجمین قرآن کی روحوں کو بڑی اذیت پہنچائی ہے۔ انھوں نے قرآن کے ترجمے اس لئے کئے تھے کہ جو مسلمان عربی سے ناواقف ہیں ان کے لئے اللہ کی کتاب سے فائدہ اٹھانے کی ایک راہ کھول دیں، انھیں کیا خبر تھی کہ ان کے بعد ایک ایسا زمانہ آئے گا، جس میں ایک ایسا گروہ پیدا ہوگا جو انھیں ترجموں کو پاکر اجتہاد و تحقیق کی مسندیں بچھا دے گا۔ اور ابن تیمیہ و ابن قیم اور ابن جریر اور رازی سب اس کے سیلاب اجتہاد میں بہ جائینگے اگر اس فتنہ کی خبر انھیں ہوتی تو یقیناً نادانوں کے ہاتھوں میں وہ یہ تلوار نہ دیتے۔

ہمارے دوست یقین کریں کہ ہم نے ان کے قرآنی مضامین کو ہمیشہ قدر و عزت کی نگاہوں سے دیکھا ہے، اور ان کو عام لکھنے والوں میں ایک مستثنیٰ درجہ دیا ہے۔ لیکن بحث و مذاکرہ سے تو کسی کو بھی اپنے تئیں بالاتر نہیں خیال کرنا چاہئے۔ یہ تو طالب العلمانہ افہام و تفہیم ہے۔ ہم اگر کوئی بات نہیں سمجھے ہیں آپ سمجھا دیجئے۔ خفا ہو کر برا بھلا کہہ دینے سے تو کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا! آپ نے ہم لوگوں پر ادعائے علم و واقفیت کا بھی الزام لگایا ہے اور غصہ کی جھنجھلاہٹ میں "جماعتی عصبیت" اور "روایتی مسلک" کے بھی الفاظ بول گئے ہیں۔ افسوس ہے کہ ان معاملات میں آپ لوگوں کو ہمارا حال معلوم نہیں ورنہ اپنے ان قیمتی لفظوں کو آپ اس بیدردی سے ضائع نہ کرتے۔ ادعائے علم و واقفیت

اولاً تو قرآن کے معاملہ میں کسی کو ہونا نہیں چاہئے کہ۔

در محفلے کہ خورشید اندر شمار ذرہ است خود را بزرگ دیدن شرط ادب نہ باشد

اور اگر ہو تو اُن لوگوں کو ہو جنکو یہ جامہ زیب دیتا ہے۔ اس کیلئے اپنے قامت کی ناموزونی تو اسقدر نمایاں ہے کہ چھپائے نہیں چھپ سکتی۔

اپنی محرومی و تشنہ لبی کا تو یہ عالم ہے کہ مرحوم غالب نے کہا تھا۔

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ میرے لئے تو دُرد تہ جام بہت ہے

ہم نے یہ شرم بھی اٹھا دی، تاہم ہنوز منتظر چشم التفات ساقی ہی رہے! اور یقین کیجئے کہ یہی نارسائی بخت ہے جس نے مجبور کیا کہ اس "روایتی مسلک" کو اختیار کر لینے کا ننگ گوارا کر لیں جس کے نام سے آپ لوگوں کو گھن آتی ہے۔ اور اس باب میں ہم کو ملامت کرنے میں جلدی نہ کیجئے۔ بادشاہوں کی نظر میں لعل و گہر کی بھی کوئی قیمت نہیں ہوتی لیکن فقیر تو راہ میں پڑی ہوئی کوڑی بھی اٹھا لیتا ہے۔ گنگا اور جمنا کے کنارے بسنے والے کیا جانیں کہ صحرا کا تشنہ لب مسافر اپنی پیاس بجھانے کیلئے کیا کیا جتن کرتا ہے۔ جو سیمرغ کا شکار نہیں کر سکتے وہ کنجشک کے لئے دام بچھاتے ہیں اور اسی کو شکار کر کے خوش ہو لیتے ہیں۔ آپ لوگوں کی سی قسمت ہر شخص کہاں سے لائے؟ پھر "اس کو" نہ پاکر "اپنے کو کھو آنے" کا حوصلہ کوئی معمولی عزم و ہمت کا کام ہے! پس ہم تہی دامنوں کی اس محرومی پر آپ لوگوں کو ہنسنا نہیں چاہئے، رحم کرنا چاہئے۔

"جماعتی عصبیت" کا الزام بھی محض آپ لوگوں کا حسن ظن کریمانہ ہے۔ یہاں تو صحرا کے تنہا درخت کا سا معاملہ ہے جس کے سایہ کے سوا کوئی اس کا رفیق نہیں۔ ہم جیسے بے نواؤں کو اپنی جماعت میں کون لے گا؟ اور لے گا تو کیا فائدہ اٹھائے گا۔

کسی نے مول نہ پوچھا دلِ شکستہ کا
کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا

پرویز صاحب سے نہایت ادب سے گذارش ہے کہ وہ نکتہ چینی سے گھبرا نہ جایا کریں۔ گھبرانے سے مشکلیں حل نہیں ہوا کرتیں، خواجہ حافظ کی نصیحت ہے کہ

مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

پس ان کو چاہیے کہ وہ مولوی اختر احسن صاحب کا مضمون دوبارہ سمجھکر پڑھیں۔ انشاءاللہ وہ ان کے لیے مفید ہوگا۔ ہم نے مولوی اختر احسن صاحب سے بھی درخواست کی ہے کہ وہ اپنے مضمون کے خاص خاص مباحث کی طرف مکرر توجہ دلا دیں۔ امید ہے کہ آئندہ نمبر میں ان کا مضمون شائع ہو سکے گا۔

تفسیر سورۂ کوثر (اردو)

استاذ امام علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں کوثر کی تحقیق خانہ کعبہ کی روحانی حقیقت اور نماز اور قربانی کے اسرار و حقائق پر مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس کی اصلی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ کتابت و طباعت جاذب نظر کاغذ عمدہ تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶ حجم ۱۲۳ صفحے قیمت ۸/

فلیح

از جناب خواجہ ابوالحسن صاحب محکمہ تعلیمات حکومت ہند شملہ

"اس مضمون کے بعض دلائل سے ہم مطمئن نہیں ہیں لیکن ایک مسئلہ کی توضیح کے لئے دوسروں کے نقطۂ نظر کو پیش کرنا فائدہ سے خالی نہیں ہے۔ اس لئے یہ تحریر شائع کی جاتی ہے۔" (الاصلاح)

مسئلہ نجات پر "الاصلاح" کی گذشتہ اشاعتوں میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے اور جس طریق پر یہ مسئلہ معرض بحث میں لایا گیا ہے۔ اس نے بجائے واضح کرنے کے اسے اور پیچیدہ کر دیا ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ اسے اس طرح صاف کر دیا جائے کہ پوری طرح دلنشین ہو جائے۔ میں بھی اس کے متعلق اپنی معلومات پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں ممکن ہے کہ اہل نظر اسے پسند فرمائیں۔

اس مسئلہ پر غور کرنے سے پیشتر ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ وہ کونسی باتیں ہیں جنکا اعتراف یا عمل ہمیں نجات دلا سکتا ہے اور وہ کون سی چیز ہے جس کا انکار ہمیں دوزخ کی طرف لے جائے گا۔ قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے جس قدر رسول بھی نوع انسانی کی طرف مبعوث کئے ان کی رسالت کا مقصد وحید صرف یہی تھا کہ سب انسان خدا کی وحدانیت کا اعتراف کریں اور صرف اسی کی عبادت کریں۔ چنانچہ فرمایا

(۱) وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن	ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول بھی دنیا میں نہیں بھیجا
رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ	مگر اس وحی کے ساتھ کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں
إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ ۲۱/۲۴	پس میری ہی عبادت کرو۔
(۲) وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا	اور بلاشبہ ہم نے دنیا کی ہر قوم میں ایک پیغمبر مبعوث کیا

اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَاجۡتَنِبُوا الطَّاغُوۡتَ جس کی تعلیم یہ تھی کہ اللہ کی عبادت کرو اور سرکش وشریر حاکموں کے اغوا سے بچو۔ ۱۶/۳۸

چونکہ خدا کی ہستی کا اعتقاد انسان کی فطرت میں ودیعت کردیا گیا ہے اور فطرت انسانی روزِ ازل میں میثاق الست پر مہر بلیٰ ثبت کرچکی ہے اس لئے پیغمبروں کے ذریعہ بھی اسی میثاق کی تجدید کا مطالبہ کیا گیا اور کسی ایسی بات کا اقرار نہیں لیا گیا جو فطرت انسانی میں داخل نہ تھی۔ اب اگر انسان خدا کی وحدانیت کا اعتراف نہیں کرتا اور رسولوں کی تعلیم کے خلاف عمل پیرا ہوتا ہے تو وہ اپنی فطرت کے خلاف سرکشی کرتا ہے اور اپنا میثاق توڑ ڈالتا ہے۔ اب وہ انسانیت کے درجہ سے بہت نیچے گر گیا اور اس قابل نہیں رہا کہ جنت میں اس مخلوق کے ساتھ رہ سکے جس نے اپنی فطرت نہیں بدلی بلکہ اسے اس مخلوق کے پاس جگہ ملے گی جو اپنا فطری پیمان بھلا کر خدا سے بغاوت کرچکی ہے۔ لیکن اگر وہ اپنی صدائے فطرت کو لبیک کہتا ہے اور سرکشی کرکے اسے مسخ نہیں کرتا اور اللہ کے رسولوں کی دعوت پر کان دھرتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ نعائم اخروی کا مستحق ہو اور نجات حاصل کرے۔ اس ایک میثاق کے علاوہ کوئی اور عہد میثاق نہیں جو روز ازل میں اس سے لیا گیا ہو نہ کوئی اور اعتقاد ہے جو اس کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہو۔ اب اگر دنیا میں آکر اسے اور باتوں کا حکم دیا جاتا ہے۔ اور وہ ان میں سے بعض کی یا اکثر کی خلاف ورزی کرتا ہے تو گو وہ نافرمانی کا مرتکب ہوتا ہے مگر اس نافرمانی سے وہ اپنی فطرت کو پامال نہیں کرتا۔ اسے مکدر و زنگ آلود کردیتا ہے۔ اس کی پاداش میں جو سزا اسے ملے گی وہ اس کے جرم کی نوعیت کے مطابق ہونی چاہئے تاکہ اس کے آئینہ فطرت کا زنگ دور ہوجائے اور اس کی فطرت اپنی اصلی حالت پر آجائے۔

جہاں تک میرا علم ناقص ہے قرآن سے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ اعمال صالحہ ایمان کی نشو ونما کا باعث ہوتے ہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کی پختگی اعمال کی قبولیت کا سبب ہوتی ہے اور

انسان کی روحانی ترقی اور اس کا ذہنی و فکری نشو نما اس کی ایمانی حالت پر موقوف ہے۔ اگر اس کا ایمان درست نہیں تو اس کا کوئی عمل بھی مقبول نہیں۔ خود انبیاء کرام کی نسبت سورہ انعام میں کہا گیا ہے کہ "لو اشرکو الحبط عنھم ما کانوا یعملون" برعکس اس کے کہ اگر اس کی ساری عمر بد اعمالیوں میں گذری مگر آخری لمحات حیات میں، ایک لمحہ سچے ایمان کا مل گیا تو اس کی ساری سابقہ بد اعمالیوں کی تلافی ہوگئی۔ ساحران فرعون کی ساری عمر کفر و بدعملی میں گذری مگر ایک لمحہ کے سچے ایمان نے انھیں نہ صرف جنت کا حق دار بنا دیا بلکہ ان کا تزکیہ نفس کر کے انھیں بلند مقامات پر پہنچا دیا۔ چنانچہ ساحران فرعون کے واقعہ کے بعد ہی فرمایا ہے "من یاتہ مومناً قد عمل الصالحت فاولئک لھم الدرجات العلیٰ جنّٰت عدن تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا و ذلک جزاء من تزکیٰ" (طٰہٰ)

اسی طرح سورہ یٰسین میں ایک بستی کی مثال بیان فرمائی جہاں اللہ کے رسول بھیجے گئے، مگر بستی والوں نے ان کی دعوت قبول نہ کی۔ صرف ایک آدمی ایمان لایا اور ایمان لانے کی وجہ سے مار ڈالا گیا مرنے کے ساتھ ہی اسے جنت کی بشارت مل جاتی ہے "قیل ادخل الجنۃ قال یالیت قومی یعلمون بما غفرلی ربی وجعلنی من المکرمین" یہ ظاہر ہے کہ وہ آدمی ایمان لانے سے پیشتر کافر تھا۔ اس کی ساری عمر بداعمالیوں میں گذری مگر ایمان لانے کے ساتھ ہی وہ تمام معاصی سے پاک وصاف ہوگیا۔

مندرجہ بالا تصریحات سے یہ صاف ظاہر ہے کہ دراصل ایمان ہی نجات کا موجب ہے۔ اگر ایمان کے ساتھ اچھے اعمال ہیں تو انسان کو جلد نجات مل جائیگی۔ اگر برے ہیں تو وہ اپنے اعمال بد کی سزا پائے گا اسکی وجہ سے اس کی نجات میں تاخیر ہو جائے گی مگر نجات سے محروم نہیں رہے گا اور یہی حقیقت حدیث نبوی میں بیان کی گئی ہے "یخرج من النار من کان فی قلبہ مثقال ذرۃ من ایمان" (ترمذی)

اسی سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ کم عمر مسلمان بچے بھی ضرور نجات پائیں گے۔ چونکہ وہ اپنی فطرت صالحہ پر جو روز ازل میں خدا کی ہستی کا اقرار کر چکی ہے، دنیا سے گئے ہیں اس لئے وہ مومن تصور کر لئے جائیں گے

اگر انھیں اعمال صالحہ کا موقع نہیں ملا تو نہ سہی، اس سے ان کی فطرت میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوئی۔ وہ بدستور اپنی اصلی حالت پر قائم رہی۔ رسول اللہ کے اس ارشاد سے بھی کہ ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ بعد میں لوگ اسے یہودی و نصرانی بنا لیتے ہیں اسی خیال کی تائید ہوتی ہے۔

الغرض جمہور اہل اسلام کا یہ اعتقاد کہ ہر مومن کے لئے بالآخر نجات ہوگی خواہ وہ بدعمل ہی کیوں نہ ہو قرآن حکیم و سنت نبوی کی تصریحات پر مبنی ہے۔ اور اس سے انکار یا اعراض اہل حق کا شیوہ نہیں۔ فبشر عبادی الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ اولئک الذین ہداہم اللہ و اولئک ہم اولوا الالباب

تفسیر سورہ لہب (اردو)

استاذ امام علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۃ اللہب کا اردو ترجمہ ہے اس میں اس عام خیال کی مدلل تردید کی گئی ہے کہ یہ سورہ بدعا ہے۔ ابولہب اور اس کی بیوی کے وجوہ ذکر نہایت اثر انگیز ہیں۔ اس تفسیر کی اصلی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ کتابت و طباعت بہترین۔ کاغذ نہایت عمدہ۔ حجم ۴۸ صفحے۔ قیمت :- ۶/

منیجر

ادبیات

غزل

از

جناب مولانا کیفی چریاکوٹی

سو داغ تمناؤں کے، ہم کھائے ہوئے ہیں
گل، جتنے ہیں اس باغ میں مرجھائے ہوئے ہیں

شرمندہ ہوں میں اپنی دعاؤں کے اثر سے
وہ آج پریشان ہیں گھبرائے ہوئے ہیں

خودداریٔ گیسو کا ہے اس رخ پہ یہ عالم
جھکنا جو پڑا ان کو تو بل کھائے ہوئے ہیں

اب تم بھی ذرا حسن جہاں سوز کو روکو
ہم تو دل بے تاب کو سمجھائے ہوئے ہیں

اے دست کرم! پھینک دے کونین کو اس میں
دامن کو ترے سامنے پھیلائے ہوئے ہیں

کچھ ذوقِ تماشا بھی ہے، کچھ حسن نظر بھی
دل ہاتھ میں وہ دیکھ کے للچائے ہوئے ہیں

اب اپنی جبیں پھوڑیں گے در پر ترے محتاج
یہ یاد ہیں تقدیر کے ٹھکرائے ہوئے ہیں

حیران ہیں کس شکل سے ہم سامنے جائیں
ہنگام قیامت ہے وہ جھلائے ہوئے ہیں

پینا ہے ہمیں زہر الم آج طبیبو!
ہٹ جاؤ کہ مرنے کی قسم کھائے ہوئے ہیں

آتا ہے بڑھا بحرِ کرم جوش میں کیفی،
ہم اپنے گناہوں پہ جو شرمائے ہوئے ہیں

تلخیصات

موجودہ دنیائے سیاست کے عناصر اربعہ

مسولینی۔ ہٹلر۔ اسٹالین۔ اتاترک

حالات وخصوصیات کی حیرت انگیز یکسانی

جو لوگ اخبارات و رسائل پڑھتے ہیں اور موجودہ زمانہ کے حالات سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہیں، ان کے دل میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہوگا کہ مسولینی، ہٹلر، اسٹالین اور اتاترک اس فرمانروائی بلکہ مطلق العنانی کے درجہ تک کیسے پہنچ گئے۔ کیا ان کے اندر کوئی غیرمعمولی طاقت مخفی ہے؟ ان کو کوئی غیبی امداد حاصل ہے؟ حسن خلق۔ فہم وتدبر اور اصابت رائے میں وہ کوئی مافوق العادۃ جوہر رکھتے ہیں؟ ذاتی وجاہت اور خاندانی شرافت کی کوئی نمایاں برتری ان کو حاصل ہے؟ آخر کیا بات ہے کہ وہ چشم زدن میں ترقی کے آسمان پر پہنچ گئے؟ یہ کوئی جادو تو نہیں ہے؟

ہمارے لئے ان سوالوں کا جواب دینا مشکل ہے البتہ اتنا ہم ضرور کر سکتے ہیں کہ ان تمام خصوصیات کو، جہاں تک معلوم ہو سکیں، یکجا کر دیں، جو ان حکمرانوں کے درمیان مشترک طور پر پائی جاتی ہیں تاکہ ناظرین خود کسی صحیح فیصلہ تک پہونچنے کی کوشش کریں۔

ان حکمرانوں کی ملک گیری اور سیاسی ترقی کے حالات ہی نہ صرف یکساں طرح کے ہیں

بلکہ ان کی مرزبوم، طریق رہائش، ابتدائی نشو و نما، تعلیم و تربیت، خانگی زندگی اور روزمرہ کے مشاغل بھی ایک ہی قسم کے ہیں۔ سب ایسے باپوں کے فرزند ہیں جو بالکل ٹھیٹ دیہاتی تھے۔ زراعت، مویشیوں کی پرورش، اور دوسری دیہاتی صنعتیں ان کا محبوب پیشہ تھیں۔ علم سے بے بہرہ، مال و دولت سے محروم بالکل اجڈ اور گنوار تھے۔ علمی بے مائگی کی وجہ سے ان کے مزاج ٹیڑھے اور طبیعتیں سخت تھیں۔ مفلسی کی محنت و مشقت سے چور تھے۔ شب و روز کشادگی اور فراغت کے خواب دیکھتے اور ان کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ تلاش معاش کی دوڑ دھوپ میں ان کسانوں سے آگے نکل جائیں جو تمازت آفتاب اور جاڑے کی ٹھنڈ سے نڈھال ہیں۔

مسولینی اپنے باپ کے متعلق بیان کرتا ہے کہ "میرے باپ نے کبھی مدرسہ کا رخ نہیں دیکھا۔ دس برس کا ہوا تو اس کو پڑوس کے گاؤں میں ایک لوہار کی دوکان پر بیٹھا دیا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد جب اسے لوہاری کے کاموں میں مہارت ہوگئی تو اس نے اپنی ذاتی دوکان کھول لی۔ اسی زمانہ میں اس نے اشتراکیوں سے ربط ضبط قائم کیا۔ اشتراکیوں کی باتیں غور و توجہ سے سنتا۔ ان سے مشورے کرتا اور ان کے خیالات کی گانوں والوں میں تبلیغ کرتا۔ رفتہ رفتہ اس کے بہت سے ہم خیال پیدا ہوگئے اور ایک ایسی جماعت تیار ہوگئی جس نے پولیس کے عیش و آرام اور خواب خور کو تلخ کر دیا۔"

اس نے بڑی بے رحم طبیعت پائی تھی۔ مسولینی پر اس کی بے رحمیاں مشہور ہوگئی تھیں۔ اس نے کبھی مسولینی سے شفقت و نرمی کا برتاؤ نہ کیا۔ بات بات پر اپنی سنگدلی کا اظہار کرتا۔ مسولینی اپنی "آپ بیتی" میں لکھتا ہے کہ "میں جب کبھی لوہے کی دوکان میں، بھٹی سے نکلتے ہوئے شراروں اور گرم لوہے سے اڑتی ہوئی چنگاریوں سے بچنے کے لئے اپنا چہرہ چھپاتا تو میرا باپ میری کوڑے سے خبر لیتا۔ اس زد و کوب سے ڈر کر ایک شب میں، میں گھر سے نکل بھاگا یہ اس وقت کی بات ہے جب

میری عمر صرف سات برس کی تھی۔"

ایک اور واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مسولینی کے باپ نے اس کی تربیت میں ہمیشہ خشونت اور سخت گیری سے کام لیا۔ ایک مرتبہ وہ مسولینی کے لئے ایک چھوٹا سا کھلونا لایا اور اس کو اس کے دوسرے ساتھیوں کے سامنے اس کے کھیلنے کا ڈھنگ بتانے لگا۔ وفعتہً ایک شوخ لڑکا مسولینی کے ہاتھ سے کھلونا چھین کر چلتا بنا۔ مسولینی رونے لگا اس کے باپ نے یہ ماجرا دیکھا تو اس کو بری طرح ڈانٹ بتائی کہ "تو اپنے ہمسن سے ڈر گیا۔ کھلونا لیکر اسے کیوں جانے دیا۔ لڑکا ہو کر لڑکیوں کی طرح آنسو بہاتا ہے۔ تونے اسے پکڑا کیوں نہیں طمانچہ کا جواب طمانچہ سے اور گھونسے کا جواب گھونسے سے کیوں نہیں دیا؟" یہ کہکر اس نے اپنا سخت اور مضبوط ہاتھ اٹھایا اور مسولینی کے منہ پر زور سے ایک تھپڑ رسید کیا۔ مار کھا لینے کے بعد مسولینی نے بھی ایک چکنا پتھر اٹھا کر اپنے حریف کو دوڑایا کچھ دور جا کر اسے پالیا، اور اس کے سر پر ایسا پتھر مارا کہ اس کا سر پھٹ گیا۔

ہٹلر کا باپ بھی ایک مفلوک الحال دیہاتی تھا۔ تیرہ برس کے سن میں اسے پیٹ کی فکر دامنگیر ہو گئی۔ مجبوراً وطن کو خیرباد کہنا پڑا۔ روزگار کی تلاش میں پھرتا پھراتا وائنا پہنچا۔ جہاں اس نے جوتہ بنانے کا کام شروع کیا۔ لیکن صرف اسی صنعت پر قناعت اس کے لئے مشکل تھی۔ وہ محتاج اور تہی دست رہنا پسند نہ کرتا تھا۔ شب و روز اپنی حالت کے سدھارنے میں کوشاں رہتا۔ بڑی کوششوں سے ۲۳ برس کے بعد اسے چنگی خانہ میں ایک ملازمت ملی۔ اپنی زندگی کو مسرور بنانے میں اسے بڑی مشقتیں برداشت کرنی پڑی تھیں۔ اس نے تین شادیاں کیں۔ اور اس کی زندگی کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی لذتیں حاصل کرنے میں نہایت بے صبرا اور جلدباز تھا۔

اس کی عمر جب پچاس سے متجاوز ہوئی تو اس نے اپنا تمام کاروبار بند کر دیا۔ اور ریف میں آکر اقامت اختیار کر لی۔ اسے ہر شخص سے نفرت تھی۔ وہ برتری کا گھمنڈ ظاہر کرنا چاہتا تھا مگر لوگ اس کے ماضی سے خوب واقف تھے۔ دلدوز فقروں اور چبھتے ہوئے جملوں سے اس کے غرور کا مقابلہ کرتے۔ بالآخر مجبور ہو کر گھر کے اندر ہی اپنی بڑائی کا مظاہرہ کیا کرتا۔ اپنی اولاد کی تربیت میں بڑا ہی سخت دبے رحم تھا۔ اس کے بے رحم ہاتھ اور خوفناک ڈنڈے کو دیکھ کر لوگوں کو بڑا دکھ ہوتا۔ اس ماحول میں تربیت پانے کے بعد۔ ہٹلر کی خود رائی، سختی طبعی اور اس کی بہادری پر کسے تعجب ہو سکتا ہے:

اسٹالین اور اتاتورک کے باپ بھی اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں، نہایت سخت گیر تھے۔ ڈنڈے کی سیاست، طاقت کے اظہار اور بے دردانہ سلوک میں مسولینی اور ہٹلر کے باپ سے یہ کچھ کم نہ تھے۔ طرفہ یہ ہے کہ ان چاروں بچوں کو اپنے باپوں کی خدمت و اطاعت کا موقع بہت کم ملا۔ اتاتورک نو ہی برس کے تھے کہ ان کے والد نے رحلت فرمائی۔ اسٹالین ابھی گیارہ برس کا بھی نہ ہوا تھا کہ اسے باپ کے مرنے کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ ہٹلر کی عمر صرف تیرہ برس کی تھی کہ اس کا باپ انتقال کر گیا۔ مسولینی نے اپنے باپ کی بیرحمیوں سے اسی وقت نجات حاصل کر لی تھی جب اس نے گھر چھوڑا اور دور دراز کے ایک مدرسہ میں اپنا نام لکھایا۔ ان نوجوانوں کے باپوں نے جتنی ان کی تربیت کی تھی اور جتنا کچھ ان کے اخلاق و عادات کو درست کر سکے تھے۔ اس سے کہیں زیادہ اپنے اخلاق کی درستگی اور اپنی حالت کے سدھارنے کا موقع انھیں ان کے مرجانے کے بعد نصیب ہوا۔ باپوں کے مرنے کے بعد جو زمانہ انھیں ہاتھ آیا وہی ان کے بننے کا زمانہ تھا۔ اس میں ان کی رائیں آزاد ہوئیں اور ان کے اندر اپنے آپ پر بھروسہ کرنے کی قوت پیدا ہوئی۔ وہ اپنے فرائض و واجبات اور اپنی قدر و قیمت پہچاننے پر مجبور ہوئے۔

مسولینی ہٹلر، اسٹالین اور اتاتورک کے باپوں نے جس طرح کی مشترک عادات وصفات اپنے بچوں کو سونپیں، بالکل اسی طرح کے مشابہ طور وطریق، ان بچوں نے اپنی ماؤں سے بھی سیکھے۔ یہ عورتیں خصوصیات میں اپنے شوہروں کی ضد تھیں۔ وہ جتنے اکھڑ، بے رحم اور اُجڈ تھے، اتنی ہی یہ رحم دل، نرم مزاج، فرمانبردار اور پارسا تھیں۔ سب کی سب کثیر العیال تھیں، مذہب سے انھیں عشق تھا۔ تقویٰ ودینداری ان میں کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی تھی۔ دنیا کے تمام کام دھندوں سے الگ تھلگ رہکر صرف خانہ داری کے انتظام اور بچوں کی دیکھ بھال میں منہمک رہتیں۔ فاقہ اور تنگدستی کی تمام مصیبتیں انھوں نے نہایت خوشی خوشی جھیلیں۔

یہ کہنا چاہئے کہ ان حکمرانوں کی تربیت دو بالکل متضاد قسم کے حالات وعوامل کے اندر ہوئی ہے۔ عامل انقلاب، جو ان کے باپوں کے سینوں میں موجزن تھا۔ اور عامل ایمان، جو ان کی ماؤں کی پیشانیوں پر اطمینان ومسرت سے جھلکتا تھا۔ اتاتورک کی والدہ اور ان کے والد میں عرصہ دراز تک اس بات پر جھگڑا رہا کہ اتاتورک کے والد، اتاتورک کے لئے محض قرآن وفقہ کی تعلیم کو کافی نہ سمجھتے تھے۔ مسولینی کے انقلاب پسند باپ اور اس کی نیک ماں کے درمیان مسولینی کی تعلیم کا معاملہ ایک مستقل وجہ نزاع تھا۔ ماں کی دلی خواہش تھی کہ بچے کی تعلیم مذہبی ہو۔ ہٹلر کی ماں اپنے بچے کو مذہبی گیتیں یا ذکر نیکی طرف متوجہ دیکھکر بہت خوش ہوتی۔ اس کی سب سے محبوب آرزو یہ تھی کہ خدا ہٹلر کو مسیح کا خادم بنا دے اور وہ اس دنیا سے کٹکر صرف خدا کا ہو جائے۔ اسٹالین کی ماں منت مانی تھی کہ اگر اسٹالین زندہ رہا تو اسے کنیسہ کا خادم بنائے گی۔ چودہ برس کے سن میں اس کو الٰہیات کے ایک مدرسہ میں داخل کر دیا۔ جوں جوں زمانہ گزرا اس کی مذہبی تعلیم اور رہبانیت کی مشق ترقی کرتی رہی۔ وہاں اس کو کسی ایسی قیادت کی تعلیم نہیں دی گئی جو کسی حکومت کے حصول کا ذریعہ ہو۔

یہ چاروں حکمراں نہایت بہادر، جسیم شحیم، تندرست اور قوی الاعصاب ہیں۔ لیکن ان کی مائیں نہایت ہی کمزور اور ضعیف البنیہ تھیں۔ مسولینی کی ماں بہت سے امراض میں گرفتار تھی۔ ساری رات آنکھوں میں کاٹتی اور بستر پر پڑی درد سے چلایا کرتی۔

ان حکمرانوں کے بچپن اور جوانی کے حالات سے یہ اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ ان کے تمام عادات و اطوار اور تمام خصوصیاتِ زندگی ایک دوسرے سے بالکل مماثل ہیں۔ اب ہم اپنے دعویٰ کی تائید میں خود انہی کی زبانی چند واقعات کا اور اضافہ کرتے ہیں۔ مسولینی بیان کرتا ہے کہ "میں ایک بدمزاج اور شریر لڑکا تھا۔ دروازہ کی کنڈیاں کھٹکھٹائے بغیر سڑک پر نہ آتا۔ گھر لوٹتا تو تمام بدن چوٹوں سے داغ دار ہوتا۔ مگر میں انتقام سے بھی باز نہ آتا تھا۔" اتاتورک کو ان کے استاد کے، صرف ایک فقرہ نے برانگیختہ کر دیا پھر اس تاریخ سے انھوں نے اس مدرسہ کا رخ نہ کیا۔ اسٹالین بدمزاج اور آوارہ لونڈوں کا سرغنہ تھا۔

ہٹلر کے متعلق ایک ابتدائی مدرسہ کا استاد بیان کرتا ہے کہ "ہٹلر ایک شریر، ضدی اور بہادر لڑکا تھا۔ اسے اپنے ہمجولیوں سے بہت کم انس تھا۔ اس کے ساتھی بھی اس سے زیادہ ربط ضبط نہ رکھتے تھے۔ ایک سے زیادہ دوست اسے کم ملے۔ مسولینی کی شرارت یہاں تک بڑھی ہوئی تھی کہ گاؤں ہی کی ایک لڑکی کو دیکھتا تو اس کو کمزور پاکر چھیڑتا۔ اس کے بالوں کو زور سے کھینچتا۔ جس سے لڑکی رونے اور چلانے لگتی اور وہ اس کی بے بسی و بے چارگی سے محظوظ ہوتا۔ اتاتورک اپنے ضمیر اور رائے کی پابندی میں اتنے آزاد تھے کہ ان کی یہ آزادی ان کے دوستوں کو ناگوار ہوتی لیکن وہ وہی کرتے جو ان کے دل میں ہوتا اور سب کو بادل ناخواستہ اسی کا پابند ہونا پڑتا۔

ایک اور خصوصیت جو ان چاروں حکمرانوں کو مشترک طور پر حاصل ہے۔ اور جس کا ان کے

خیالات اور رجحانات زندگی پر خاص اثر ہوا وہ ان کی ماؤں کی مادرانہ شفقت ہے۔ وہ اپنے بے رحم باپوں کی محبت سے جسقدر محروم تھے ان کی مائیں اتنی ہی ان پر مہربان تھیں۔ ان شفقتوں اور نازبرداریوں کا یہ اثر ہوا کہ یہ ایثار و خودداری میں بالغ العقل لوگوں سے بھی بڑھ گئے۔ ہٹلر کہتا ہے کہ "میں باپ کا احترام کرتا ہوں اور ماں سے محبت" اور درحقیقت اس کو یہی کہنا چاہئے کیونکہ جب اسکے باپ کا انتقال ہوگیا اور تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا تو بجز ماں کی شفقت کے اور کوئی سہارا اس کے لئے باقی نہیں رہ گیا تھا۔ وہ دن بھر گھر پر رہتا۔ کھاتا، پیتا، کھیلتا اور سو رہتا۔ اس کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ دکھیاری ماں آٹھے وال کی فکر میں پریشان رہتی۔ چار سال یونہی گذر گئے۔ مگر فقر و فاقہ کے باوجود اس کی ماں نے اسے کبھی آزردہ نہیں کیا۔ مسولینی کہتا ہے کہ "میں اپنے دل کی انتہائی گہرائیوں میں ماں کی محبت محسوس کرتا ہوں۔ اس نے میری خاطر بڑے دکھ اٹھائے میں جس چیز کے لئے مچل جاتا، اس کے مہیا کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتی۔ میری حالت سدھارنے کی غرض سے متواتر کئی کئی گھنٹے کام کرتی اور اف تک نہ کرتی" اسٹالین اور اتاترک کی ماؤں کا بھی قریب قریب یہی حال تھا۔

ان حکمرانوں کی چند مشترک خصوصیات اور ہیں جن کا ذکر فائدہ سے خالی نہ ہوگا، لیکن ہم بقصد اختصار ان کو نظر انداز کرتے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ ان کو ابتدا ہی سے ایسے حالات پیش آتے گئے جو ان کو موجودہ منازل تک کھینچ لائے۔ ان سب کی ابتدائی زندگیاں نہایت فلاکت و عسرت میں بسر ہوئیں۔ مسولینی عرصہ تک اسپین کی خاک چھانتا رہا۔ اسے تھوڑی سی چٹیل زمین بھی گذارے کو نہ ملی۔ ہٹلر باپ کے مرنے کے بعد ... کی گلیوں میں ٹھوکریں کھاتا پھرا۔ پیٹ بھرنے کو روٹی اور سر چھپانے کو کوئی جگہ نصیب نہ ہوتی۔ جنگلوں اور راہ گیروں کے ساتھ سڑکوں پر رات کو پڑ رہتا۔ یہانتک کہ مجبور ہو کر اسے دو شرں کے سامنے

ہاتھ پھیلانا پڑا۔ کم و بیش انہی حالات سے اسٹالین کو بھی دوچار ہونا پڑا۔

ان حکمرانوں کو اوائل عمر میں جس طرح غربت و مسکینی کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، اسی طرح جوانی میں قید و بند کی مشقتیں برداشت کرنی پڑیں۔ اسٹالین چھ مرتبہ جیل گیا۔ مسولینی، اٹلی، سوئیزر اور اسٹریا کے مختلف جیلوں میں گیارہ بار قید ہوا۔ استنبول میں اتاتورک کا "لال قیدخانہ" مشہور تھا۔ انھیں متعدد بغاوتوں اور مختلف سازشوں کے جرم میں سزائیں دی گئیں۔ ہٹلر کو ایک سال تک قیدخانہ میں رہنا پڑا۔ قیدخانہ ہی میں اس نے اپنی مشہور تصنیف "میری جد و جہد" لکھی۔ غرض سب نے قید و بند کا تھوڑا بہت مزہ چکھا ہے۔

عثمان

یورپ کا اخلاقی زوال

مغرب کے اخلاقی زوال کا حال ہم عرصہ سے اخباروں میں پڑھ رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں مشہور برطانوی مفکر لارڈ سالسبری کی ایک تقریر سننے کے قابل ہے۔ ذیل میں اس کا ضروری خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

لارڈ سالسبری مسیحی یورپ کے اخلاقی زوال پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں "ہم نئی دنیا کے جس گوشے پر بھی نگاہ ڈالیں، اخلاقی زبوں حالی کا ایک دردانگیز منظر ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ منظر اتنا خوفناک، تاریک اور وحشت انگیز ہے کہ اس کو دیکھ کر اصلاح حالات کی امید بالکل معدوم ہو جاتی ہے۔ فریب کاری اور جھوٹ وقت کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت ہے۔ ناجائز اور شرمناک جنسی تعلقات اور بے ایمانی مکاری کی اس درجہ گرم بازاری ہے کہ اب ہم ان انسانیت سوز حرکات واقعات کی کسی قسم کی اہمیت نہیں محسوس کرتے، جس طرف بھی نگاہ اٹھتی ہے مادیت، نفس پرستی

اورحرام کاری کا غلبہ نظر آتا ہے"۔ لارڈ سالسبری اس عالمگیر تباہی سے نجات کی صرف ایک صورت بتاتے ہیں کہ دنیا مسیح کی بتلائی ہوئی راہ پر گامزن ہوجائے۔ وہ آگے چلکر اس سے زیادہ دردانگیز لفظوں میں فرتے ہیں :۔

"یورپ کو اس بات کا فخر ہے کہ اس نے اپنے آغوش میں دنیا کے بہترین دماغوں کی پرورش کی ہے۔ لیکن کیا وہ کوئی ایسا روحانی لیڈر بھی پیدا کرسکتا ہے جو اس ہولناک تاریکی کو شکست دیکر گم کردہ راہ انسانیت کو مذہب اور خدا کی راہ پر لگا دے۔ آج اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ارباب کلیسا نے وقت کی سب سے بڑی مشکل کے سامنے سپر ڈال دی ہے ان کی ناکامی نہایت دردناک ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب تک پروردگار کائنات خود رحمت وکرم کی ملکوتی افواج کے ساتھ اس زمین پر نہ اترے انسانیت کے مصائب وآلام کا خاتمہ ناممکن ہے۔ روح انسانیت نفرت وحقارت، حرص وہوس اور خوف وہشت کے استیلاء سے پامال ہورہی ہے اور کوئی نہیں جو اس تباہی سے اس کو بچالے۔ ایک امریکی فلم ڈائرکٹر، جس نے یورپ کا سفر کیا ہے لکھتا ہے:۔

"تم ایک طرف نگاہ اٹھاؤگے تو تمھیں وہاں کسانوں کی جماعتیں نظر آئیں گی۔ ان کے کھیت، مویشی اور فارم دیکھوگے۔ پھر دوسری طرف نظر دوڑاؤگے تو بالکل اسی شکل وصورت کے انسان اور مویشی اور فارم نظر آئیں گے، ظاہری شکل وصورت کے لحاظ سے ان میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ ایک ہی شکل کے انسان ایک ہی طرح کے جانور اور ایک ہی قسم کے فارم۔ لیکن دونوں کے درمیان مشین اور بجلی کی ایسی محکم دیواریں حائل ہوں گی کہ ایک پرندہ بھی ادھر سے ادھر نہیں گذر سکتا"۔

مسیحؑ نے فرمایا تھا دشمنوں کو اپنوں کی طرح پیار کرو لیکن اقوام یورپ اپنے ہمسایوں سے شیطان کی طرح نفرت کرتی ہیں۔ اور اس نفرت کا لازمی نتیجہ وہ خوف وہراس ہے جس کا بادل آج تمام یورپ پر چھایا ہوا ہے۔

مسٹر نویل چیمبرلین نے حال ہی میں فرمایا ہے کہ اگر حملہ و جنگ کا اندیشہ جو شب و روز ہمارے دماغوں پر مسلط رہتا ہے کسی طرح دور ہو سکتا تو ہمارے لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں تھی اور یقیناً ہم یورپ کی مکدر فضا کو ایک مرتبہ پھر صاف شفاف بنا لیتے۔

اس عالمگیر خوف نہراس کے بعد اقوام یورپ کی ملک گیری اور ہوس رانی کا نمبر آتا ہے۔ جذبات حرص و ہوا کی تسکین کی خاطر دول مغرب ہر طرح کے جھوٹ، فریب، بد دیانتی اور بداخلاقی کی نہایت آسانی سے مرتکب ہوتی ہیں۔ ظلمت و تاریکی کی ان مہیب قوتوں کے نتائج یورپ کی ریاستوں میں، انکی اقتصادی بدحالیوں میں، تزئید اسلحہ کی جدوجہد میں، انجمن اقوام کی بیچارگی میں اور مقدس معاہدوں اور صلحناموں کی خلاف ورزیوں میں ہم اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں۔ جنگ کی تباہ کاریوں کے مہیا کرنے کے لئے آج روپیہ پانی کی طرح بہایا جارہا ہے۔ اور جنگ کا ہونا ناگزیر اور بالکل یقینی ہے۔ موجودہ حالت کے اندر دول یورپ کا تمام بد گمانیوں سے دور ہو کر ایک دوسرے کی طرف محبت و مودت اور اخوت و ہمدردی کا ہاتھ بڑھانا ناممکن معلوم ہوتا ہے۔

(عبدالحکیم)

اشتراکیت کی ناکامی

روس کے اشتراکی نظام نے چند سال پہلے تمام دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔ لیکن اب آہستہ آہستہ اس کی کمزوریاں واضح ہورہی ہیں اور لوگ اس سے بددل ہوتے جارہے ہیں۔ ذیل میں ایک مشہور اشتراکی ماکس اسٹیمن کے ایک مضمون کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے جس سے اس کی موجودہ حالت واضح ہوگی۔

نظام اشتراکیت کے ابتدائی مقاصد میں "ضبط نسل" کا مسئلہ مخصوص اہمیت رکھتا تھا۔

تاکہ آبادی کی بڑھتی ہوئی تعداد کو روک کر روٹی کے مسئلہ کو حل کیا جائے۔ لیکن اس سعی میں اس کو جہانتک کامیابی ہوئی ہے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ آج بھی روس میں ایسی ہزاروں عورتیں موجود ہیں جو اپنے شیر خوار بچوں کے لئے دودھ خریدنے کی طاقت نہیں رکھتیں اور ان میں کتنی ایسی ہیں جن کے سر چھپانے کے لئے کوئی جھونپڑا تک موجود نہیں ہے۔ اور پھر ستم یہ ہے کہ اب سویٹ گورنمنٹ نے بعض ایسے اعلانات کئے ہیں جو نہ صرف اس کے بنیادی اصولوں سے متصادم ہیں بلکہ عقل اور جذبات انسانی کے بھی بالکل خلاف ہیں۔ مثلاً اس نے اعلان کیا ہے کہ اب نسل خوب بڑھانی چاہیے کیونکہ ملک کی حفاظت کے لئے کثیر التعداد فوج کی ضرورت ہے۔ اس نے عورتوں کو بھی مشورہ دیا ہے کہ ہر عورت سپاہی، ہوا باز، انجنیئر بنے اور زیادہ سے زیادہ سپاہیوں کی ماں بننے کی کوشش کرے۔ اسلئے طلاق کے معاملہ کو حکومت نے بہت سخت کر دیا ہے لیکن اس راہ کی تمام مشکلیں درحقیقت مالی قسم کی ہیں جو غربا کے لئے تو ضرور رکاوٹ بن سکتی ہیں لیکن امراء کی راہ نہیں رُک سکتیں۔ اور یہ ایک ایسی بات ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک مختلف طبقوں میں بٹ جائے گا۔ جو بہر صورت اشتراکیت کے دعاوی کے بالکل خلاف ہے۔

جنگ کے معاملہ میں اب سویٹ گورنمنٹ اشتراکیت سے زیادہ سرمایہ دارانہ ذہنیت کے قریب ہے کیونکہ اب پورا روس ایک فوجی چھاؤنی بن گیا ہے اور ہر نوجوان کو مسلح رہنے کا حکم دیدیا گیا ہے کسی شخص کو، جو فوجی صلاحیت رکھتا ہے، ملک چھوڑ کر باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ جو شخص اس کی خلاف ورزی کرتا ہے، سزائے موت کا مستحق ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص گھر چھوڑ کر بھاگ گیا اور اس کے گھر والوں نے باوجود علم، حکومت کو اس واقعہ کی اطلاع نہ دی تو حکومت ایسے خاندان کو اس کی تمام مقبوضات سے محروم کر کے سائبیریا کے دور دراز علاقہ میں جلا وطن کر دیگی، اور اگر یہ واقعہ خاندان والوں کی لاعلمی میں واقع ہوا تو اس کی سزا یہ ہے کہ وہ خاندان

ہ سال کے لیۓ تمام شہری حقوق سے محروم رہے گا۔

روسی افواج کی تنظیم بالکل جرمنی اور اٹلی کے فوجی اصولوں کے مطابق ہورہی ہے اور افسروں اور سپہ سالاروں کے لیۓ اسی طرح کے امتیازات قائم کیۓ جارہے ہیں جو زار کے عہد میں رائج تھے اور جن کو سرمایہ داری کی لعنت سمجھکر سوئٹ گورنمنٹ نے مٹادیا تھا۔

موجودہ بالشویک حکومت ایک بالکل بیوروکریٹک نظام ہے۔ اس کی سیاست کی باگ چند ایسے زعماء کے ہاتھوں میں ہے جن کا جور و استبداد زار کے جور و استبداد سے بھی زیادہ مطلق العنان ہے۔ تاہم وہ دعوی کیۓ جاتے ہیں کہ انھوں نے ایک اشتراکی نظام قائم کر رکھا ہے۔ حالانکہ اشتراکیت سے ان کو دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے۔

اسٹالین نے تمام سابق سوئٹ مجالس آئین ساز کو ختم کرکے، ہٹلر اور مسولینی وغیرہ کے طریقوں پر ایک نئی مجلس آئین ساز کی تشکیل کی ہے جس میں قوم کے ارادے اور منشا کو کوئی دخل نہیں۔ اس مجلس کی دو شاخیں ہیں (۱) مجلس خصوصی (۲) مجلس عمومی۔ مجلس خصوصی کے رکن صرف اعلیٰ حکام اور رؤسا ہوسکتے ہیں۔ ان لوگوں کو مجلس عمومی میں بھی شرکت کا حق حاصل ہے۔

اسٹالین روس کا ڈکٹیٹر ہے۔ اس کے اختیارات غیر محدود ہیں۔ فرمائیے یہ استبداد نہیں تو اور کیا ہے۔ قوم کا مختلف طبقوں میں بٹ جانا ملکی اختیارات کا صرف چند مستبد لوگوں کے ہاتھوں میں محدود ہو جانا۔ مزدوروں کی مزدوری کاٹ کر امیروں کے خزانے بھرنا۔ کیا انہی برکات کے پھیلانے کے لیۓ اشتراکیت وجود میں آئی تھی؟

اسوقت بلاخوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ روس اشتراکیت کے اصولوں پر نہیں چل رہا ہے۔ کیونکہ ملک کی دولت میں ملک کے تمام باشندے برابر کے شریک نہیں ہے بلکہ وہ صرف چند آدمیوں کے ہاتھوں میں سمٹ کر رہ گئی ہے۔ جو صاحب اقتدار ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ان کا اقتدار برابر باقی

رہے۔ ان لوگوں کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ قوم حقیقت حال سے آگاہ نہ ہونے پائے تاکہ ان کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی جرأت نہ کرے۔ غور کیجئے اس کو نظام اشتراکیت کہیں گے یا نظام سرمایہ داری؟ ایک قدم اور آگے بڑھکر مزدوروں کی اجرتوں کا بھی جائزہ لیجئے جس پر اشتراکیت کی بنیاد قائم ہے۔ بعض مزدور اتنی اجرت بھی نہیں پاتے جو ان کی ضروریات زندگی کے لئے کافی ہو اور اسکے برعکس بعضوں کی ماہوار آمدنی ۵۰ گنی سے بھی زیادہ ہے مثلاً موسیو اسٹرولیاڈوف کی۔ کیا کارل مارکس نے انہی اصولوں کی تعلیم دی تھی؟

روس سے آنیوالوں کی زبانی معلوم ہوا کہ وہاں کے کارخانوں کے مالکوں اور دوسرے لوگوں کے پاس بڑی بڑی رقمیں جمع ہیں۔ وہ لوگ اسی طرح عیاشی اور اسراف کی زندگی بسر کر رہے ہیں جیسا کہ عہد زار کے امرا بسر کیا کرتے تھے۔ ان کے پاس نگاہوں کو خیرہ کرنے والے محل ہیں، شاندار موٹریں ہیں۔ خدم وحشم ہیں۔ غرضیکہ دنیاوی لذات سے متمتع ہونے کے لئے جتنے سامانوں کی ضرورت ہے سب ان کے پاس موجود ہیں۔ غرض آج اشتراکی نظام کے نام سے وہ سب کچھ روس میں ہو رہا ہے جو دنیا کی سرمایہ دار قومیں ہمیشہ سے کرتی آئی ہیں۔ لیکن بالشویک لیڈر ان باتوں کو نظرانداز کرتے جا رہے ہیں۔ ان کی ساری توجہ تو محض اس بات کیطرف ہے کہ قوم کی باگ ان کے ہاتھوں سے چھوٹنے نہ پائے۔ یہ لیڈر اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے سرمایہ دار حکومتوں سے قرضے پہ قرضے لیتے جا رہے ہیں۔ اتنے قرضے لینے کے باوجود بھی روس کے کروڑوں انسان بھوکوں مر رہے ہیں اور ان فاقہ مستوں کی تعداد بڑھتی ہی جائے گی اس لئے کہ بالآخر انہیں غریبوں کے پیٹ کاٹ کر قرضے ادا کئے جائیں گے۔

ع۔ ر۔ ناظم

التشافات

کتاب مقدس کا سب سے بڑا لغت

ایک ہزار برس کا زمانہ گذرا، ایک یہودی عالم، داؤد بن ابراہیم فاسی نے کتاب مقدس کا ایک نہایت ضخیم لغت تیار کیا تھا لیکن یہ لغت ضائع ہوگیا تھا۔ کچھ دن ہوئے بعض علمار کو اس کے بعض نسخوں کا سراغ لگا اور یورپ و امریکہ کے تمام مطابع نے اس کے حاصل کرنے کے لئے بھاگ دوڑ شروع کردی۔ لیکن اس سلسلہ میں سب سے زیادہ کامیابی پروفیسر سلومن سکوس کو ہوئی جو فیلاڈلفیا کے ڈورسی کالج میں عربی کے استاذ ہیں۔ انھوں نے یورپ کے مختلف کتبخانوں سے اس کے تمام منتشر اجزار فراہم کئے اور اب امریکہ کی یایل یونیورسٹی نے اس کا پہلا حصہ چھاپکر شائع کیا ہے اور بقیہ حصے یکے بعد دیگرے اسی یونیورسٹی کے اہتمام سے شائع ہوں گے۔

یہ عظیم الشان تصنیف اپنے زمانہ کی نہایت مشہور تصنیفوں میں تھی۔ یہاں تک کہ یہ "کتاب" کے نام سے موسوم ہوگئی تھی۔ مصنف نے اصل کتاب عربی زبان اور عبرانی حروف میں لکھی تھی۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ ابتدا میں علمائے یہود عربی زبان استعمال کرتے تھے۔ لیکن بعد میں انھوں نے اس کو چھوڑدیا۔ البتہ عبرانی حروف میں عربی زبان کا استعمال ایک حدتک باقی رہگیا۔

اس لغت کی مدد سے مفسرین توریت کی بعض ایسی مشکلیں حل ہوتی ہیں جو اب تک لاینحل تھیں۔ مثلاً ارمیا نبی کے صحیفہ میں وارد ہے کہ خداوند نے جب کہ وہ فلسطین میں تھے، ان کو حکم دیا کہ وہ فرات کی طرف جائیں اور اپنا پٹکا ایک چٹان میں وہاں چھپا دیں۔ اس موقع پر یہ سوال پیدا

ہوتا ہے کہ فرات اس سرزمین میں ہے جو قدیم زمانہ میں بابل کے نام سے مشہور تھی اور بابل و فلسطین میں اس زمانہ میں نہایت سخت عداوت تھی یہاں تک کہ کوئی شخص ان کے حدود کو پار کرکے ایک دوسرے کی سرحدوں میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر یرمیاہ نبی کے لئے یہ کیسے ممکن ہوا کہ وہ سرحد کو عبور کرکے فرات کے کناروں تک پہنچ گئے۔

علمائے تفسیر کے نزدیک یہ سوال ہمیشہ ایک معمہ رہا لیکن اس لغت نے دریافت ہوکر دفعتہً اس عقدۂ لاینحل کی تمام گتھیاں سلجھادیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ عبرانی لفظ ''پیرات'' جس کا عربی میں فرات ترجمہ کیا گیا ہے درحقیقت شہر اورشلیم کے اطراف کے اس حصہ کا نام تھا جس کو اب ''فاراح'' کہتے ہیں۔

(اگر یہ داستان سچ ہے تو اس سے ان تحریفات کا بھی ایک پہلو روشنی میں آتا ہے جو کتاب مقدس میں واقع ہوئیں۔ مترجم)

کس نکشود و نکشاید بحکمت این معمارا!

برنسٹن یونیورسٹی کے سابق پروفیسر ڈاکٹر کونکلن کا بیان ہے کہ وہ تمام کوششیں جو اب تک علمائے سائنس نے مصنوعی انسان پیدا کرنے کی راہ میں صرف کی ہیں، رائگاں گئی ہیں اور آئندہ ان کے کامیاب ہونے کی کوئی توقع نہیں ہے۔ علم انسانی کتنی ہی ترقی کرجائے لیکن زندگی کا راز اس کے لئے ہمیشہ معمہ ہی رہےگا۔ اور اگر ایسا ہوا کہ علم نے اپنے معمل کیمیائی کے اندر زندگی کا راز دریافت کرلیا تو اس روز سے انسانیت کا زوال شروع ہوجائےگا۔ کیونکہ یہ یقینی ہے کہ حیوانات کیمیاوی نلکی کے اندر سے ظہور میں آئےگا وہ بالکل ایک صناعی مخلوق اور جذبات و عواطف اور شعور و احساس سے یکقلم خالی ہوگا۔

(ع۔ر ناصر)

تقریظ و تبصرہ

بیان للناس منزل اول :- مولفہ مولانا احمد الدین ملنے کا پتہ :- دفتر امت مسلمہ امرتسر، قیمت للعمر

یہ خواجہ احمد الدین صاحب کی تفسیر بیان للناس کی پہلی منزل ہے۔ فاتحہ سے لیکر سورہ نساء کے چوبیسویں رکوع تک کی تفسیر اس میں آگئی ہے۔ یہ کتاب عرصہ ہوا ہم کو ریویو کے لئے موصول ہوئی تھی۔ خیال تھا کہ اس کو پڑھکر اس پر مفصل تبصرہ لکھیں گے۔ لیکن افسوس ہے کہ اب تک اس کو پڑھنے کی نوبت نہیں آئی اور اگر کاموں کی رفتار یہی رہی، جو آج ہے۔ تو شاید ہی کبھی اس کی نوبت آسکے۔ مجبوراً کتاب کی رسید لکھنے پر قناعت کرتے ہیں اور مصنف صاحب سے نہایت ادب سے معافی چاہتے ہیں کہ وعدہ اور ان کی پیہم یاددہانیوں کے باوجود ہم اس کتاب پر کچھ لکھنے کا موقع نہ نکال سکے۔

ہم نے تھوڑی سی فرصت میں کتاب کے بعض مباحث پر نگاہ دوڑائی۔ ہم کو یہ تفسیر بالکل پسند نہیں ہے۔ اس کا کوئی اصول نہیں ہے۔ لکھنے والے کے دماغ میں جو خیالات بھرے ہوئے ہیں ہر آیت کے ذیل میں ان کو ٹھونس دینے کے لئے بیتاب نظر آتا ہے۔ اس سے کچھ بحث نہیں کہ قرآن کے الفاظ اس کے متحمل ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ سرسری نگاہ میں بھی، جو چند صفحات سے آگے نہ بڑھ سکی، ہم کو متعدد ایسے الفاظ ملے جن کے معانی مصنف نے بالکل اپنے جی سے گڑھ لئے ہیں، لغت سے ان کو کوئی تعلق نہیں۔ اور قاعدہ زبان تو گویا، قرآن کو سمجھنے کے لئے سرے سے ضروری ہی نہیں۔

طرز بیان بھی بالکل غیر موثر بلکہ مصنوعی معلوم ہوتا ہے۔ زبان بالکل پنجابی ہے۔ سرسید مرحوم کی تفسیر میں اگر ان کی بے اعتدالیوں سے تکلیف ہوتی ہے تو کم از کم زبان کا لطف موجود ہوتا ہے۔ عام مباحث میں وسعت نظر اور ایک سچے جوش و جذبہ کی نمود ہوتی ہے۔ اس تفسیر میں یہ چیزیں بھی مفقود ہیں۔ اللہ تعالیٰ ناواقف

مسلمانوں کو اس تغیر کے فتنہ سے محفوظ رکھے۔ اور خواجہ صاحب کے متبعین کو توفیق دے کہ وہ کتاب الہی کی سچی خدمت میں مشغول ہوں۔

فصل الخطاب:۔ مصنفہ اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی۔ ملنے کا پتہ منیجر مکتبہ عبرت نجیب آباد۔ قیمت فی جلد مجلد عمر غیر مجلد ۱۲ر صفحات ۱۲۰۔ کتابت و طباعت متوسط۔

یہ کتاب عنایت اللہ خاں مشرقی بانی خاکسار تحریک کے "اختیار مطلق" پر ایک کاری ضرب ہے۔ اس میں قرآن مجید اور احادیث و واقعات تاریخ اسلام سے ثابت کیا گیا ہے کہ اس قسم کی مطلق العنانی جو بانی خاکسار تحریک اپنے لئے چاہتے ہیں اسلام میں کسی شخص کے لئے جائز نہیں ہے۔ ہم نے کتاب جابجا سے دیکھی۔ مصنف نے اپنے دعاوی کو نہایت خوبی سے ثابت کیا ہے اور الحمدللہ نفس مسئلہ پر بحث کی ہے، ذاتیات سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا ہے۔

بعض بحثیں پڑھکر محسوس ہوا کہ ان میں غیر ضروری طوالت کو راہ دی گئی ہے۔ جس سے اصل نتیجہ تک پہنچنے میں دیر لگتی ہے اور طبیعت کو الجھن ہونے لگتی ہے۔ حالانکہ مصنف کی بعض کتابیں ہم نے پڑھی ہیں۔ ان کا عام انداز یہ نہیں ہے۔

خاکسار تحریک یوں بھی اب نزع کی حالت میں پہنچ چکی تھی۔ انشاءاللہ یہ کتاب اس کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دے گی۔ اللہ تعالیٰ مصنف کو جزائے خیر دے۔ (ا۔ ن)

جمع القرآن والاحادیث:۔ مؤلفہ مولانا ابوالقاسم محمد خاں صاحب سیف بنارسی تقطیع ۲۰×۲۶/۸ حجم ۶۳ صفحے۔ کاغذ سفید، بہتر، کتابت و طباعت عمدہ۔ قیمت ۴ر ملنے کا پتہ:۔ آل انڈیا اہل حدیث دارالاشاعت۔ لاہور۔

قرآن کریم کی ترتیب کے متعلق مسلمانوں میں عام خیال ہے کہ یہ کام حضرت عثمان غنیؓ کے ہاتھوں انجام پایا۔ یہ خیال غلط ہونے کے علاوہ قرآن مجید پر نکتہ چینی کا ایک وسیع دروازہ کھولنے والا ہے۔ اسی عام غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے یہ رسالہ لکھا گیا ہے۔ آیات قرآن، احادیث اور آثار صحابہ سے مخالفین کے

تمام مزعومہ شبہات کا ازالہ کیا گیا ہے اور مستند دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن کا جامع و مرتب خود خدائے رحمان ہے۔ یعنی اس کی پوری ترتیب آنحضرت صلعم کے عہد میں ہدایت آسمانی کے مطابق ہو چکی تھی۔ قرآن کی طرح حدیثوں کے متعلق بھی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انکی تدوین بہت بعد میں ہوئی ہے۔ پیش نظر رسالہ کے ایک حصہ میں تدوین حدیث پر بھی بحث کی گئی ہے۔ اس سے متعلق عام معترضین اور منکرین حدیث کے تمام اعتراضات کا مسکت جواب دیا گیا ہے۔ اور رسول اللہ صلعم کے اقوال و صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے آثار سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ احادیث کی تحریر و ترتیب کا کام عہد رسالت میں شروع ہو چکا تھا۔ اور خود جناب رسالت مآب نے بعض صحابہ کو حدیثیں لکھوائیں اور بعض لوگوں کو لکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

مجموعی حیثیت سے یہ رسالہ قابل قدر اور عام لوگوں کے فائدہ اٹھانے کے قابل ہے۔ صرف ایک امر قابل گذارش ہے کہ ترتیب قرآن کے باب میں مصنف نے بعض آیات سے جو نتائج نکالے ہیں، ہم ان سے متفق نہیں ہیں۔ ان کے سیاق و سباق اور مطالب پر مزید غور و تعمق کی ضرورت ہے۔

ترجمان وہابیہ:۔ مصنفہ نواب صدیق حسن خان مرحوم۔ تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ حجم ۱۴۴ صفحے کاغذ اور کتابت و طباعت معمولی قیمت مع محصولڈاک ۵؎۔ ملنے کا پتہ:۔ حقانی بک ڈپو۔ امرتسر۔ (پنجاب)

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد کا زمانہ، ہندوستان میں، عام افراتفری اور انتشار و پراگندگی کا زمانہ تھا۔ مسلمانوں کے اندر ایک تباہ ہونیوالی قوم کی تمام خصوصیات پیدا ہو چکی تھیں۔ عوام تو عوام، خواص امت کو بھی باہمی نزاعوں سے فرصت نہ تھی۔ بات بات پر جھگڑے ہوتے تھے اور برطانوی عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹائے جاتے تھے۔ اسی زمانہ کی بات ہے کہ تحریک اہل حدیث جو یکسر ایک مذہبی و اصلاحی تحریک تھی، بعض مخالفین کی ریشہ دوانیوں کی بدولت برطانوی حکام کے نزدیک ایک باغیانہ تحریک بنگئی اور اکابر علمائے حدیث کو اس بدگمانی کو دور کرنے کے لئے بڑی کوششیں کرنی پڑیں۔ نواب صاحب مرحوم

کا یہ رسالہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس میں نہایت واضح دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ جماعت اہل حدیث کا محمد ابن عبدالوہاب نجدی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ جماعت نہ کسی خاص شخص کی مقلد ہے اور نہ اسے معاملات سیاسیہ سے کوئی تعلق ہے۔ آخر کے چند صفحات میں علماء احناف و اہل حدیث کا ایک صلحنامہ درج ہے، اس کی دفعات آج بھی قابل عمل ہیں۔ ان مسلمانوں کو ان پر عمل پیرا ہونا چاہئے جو آئے دن حنفیت اور وہابیت کے جھگڑوں سے اسلام کو رسوا کر رہے ہیں۔

مجاہد ہند:۔ مرتبہ مولوی محمد اسحاق صاحب حنیف امرتسری۔ مدیر مبلغ۔ تقطیع $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۱۶}$ حجم ۳۲ صفحے کاغذ اور کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ قیمت ۲؍ ملنے کا پتہ:۔ حقانی بکڈپو۔ امرتسر۔ (پنجاب)

ہندوستان کی سیاسی بیداری کی تاریخ میں مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے کارناموں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کی ساری زندگی مسلمانوں کی اصلاح و ترقی میں گذری۔ انھوں نے آزادی اور اعلاء کلمۃ اللہ کیلئے اس وقت نعرۂ حق بلند کیا جبکہ تمام عالم میں مکمل سنّاٹا تھا۔ وہ حق کی راہ میں لڑے اور اسی راہ میں انھوں نے اپنی جان عزیز قربان کردی۔ ان کی ابتدائی زندگی کے حالات، ان کے تعلیمی مشاغل، ان کی اصلاحی و تبلیغی سرگرمیاں اور مجاہدانہ کارنامے نہایت حیرت انگیز ہیں۔ جو اس چھوٹے سے رسالہ میں نہایت خوبی سے بیان ہوگئے ہیں۔ ہر مسلمان کو چاہئے کہ وہ اس دور نکبت و ادبار میں اس مجاہد اعظم کی سیرت سے زندگی اور روشنی حاصل کرے۔

کشمیر:۔ مصنفہ مولوی عبدالمجید صاحب بی۔ اے گورکھپوری (یوپی اکسائز سروس) تقطیع $\frac{۲۰ \times ۲۶}{۸}$ حجم ۱۴۳ صفحے کاغذ متوسط۔ کتابت و طباعت معمولی۔ قیمت غیر مجلد ۱۲ ۔ مجلد عہ

ملنے کا پتہ:۔ قاضی محمد مسعود علی۔ محلہ قاضی پور خورد۔ گورکھپور۔

"کشمیر" کشمیر کے دلچسپ حالات کا ایک جامع مرقع ہے۔ شروع میں مصنف کے برادر عزیز مولوی ساجد علی صاحب وکیل گورکھپور کا ایک مختصر دیباچہ ہے۔ اس کے بعد اصل کتاب کا آغاز ہوتا ہے۔

مصنف کو سیاحت کشمیر کے دوران میں جن مقامات کی سیر کا موقع ملا ہے، اس کے تاریخی جغرافی، تمدنی حالات نہایت تحقیق و کاوش سے جمع کئے ہیں نیز مختلف دور کے بزرگان دین، علماء و مشائخ اور شعرا کا بھی ذکر آگیا ہے۔ آخر میں کشمیر کی موجودہ شورش پر روشنی ڈالی گئی ہے کتاب دلچسپ اور سیر کشمیر کے شائقین کے لئے بہترین رہنما ہے۔ کتابت وطباعت اور زبان میں بعض نقائص نظر آئے، امید ہے طبع ثانی میں ان کی اصلاح ہو جائے گی۔

اثبات قربانی بآیات قرآنی:۔ ناشر حاجی بشیر احمد صاحب۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۸ حجم ۱۶ صفحے کاغذ رف کتابت وطباعت عمدہ۔ قیمت کچھ نہیں محصول ڈاک کے لئے ۱/ ۔ ملنے کا پتہ :۔ مہتمم حلقہ دعوت و ارشاد چوک بابا اٹل۔ کوچہ کوماسنگھ۔ امرتسر۔ (پنجاب)

امرتسر میں کچھ دنوں سے "حلقۂ دعوت و ارشاد" کے نام سے ایک تبلیغی ادارہ قائم ہوا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو کتاب وسنت کے مسلک اور سلف صالحین کے اتباع کی دعوت دی جائے اور جو مسلمان مغربی خیالات و افکار سے متأثر ہیں ان پر مغربی تہذیب و تمدن کے معائب اور اسلامی کلچر اور روایات کے محاسن بے نقاب کئے جائیں۔ اس نیک مقصد کے لئے اسکی طرف سے ہر ماہ میں حالات حاضرہ کے مناسب کوئی مفید تبلیغی مضمون پمفلٹ کی صورت میں شائع ہوتا ہے اور مفت تقسیم کیا جاتا ہے، ماہ جون میں اس حلقہ نے مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی مدیر ترجمان القرآن کے دو شائع شدہ مضامین کا ایک مجموعہ شائع کیا ہے۔ یہ دونوں مضامین قربانی سے متعلق ہیں۔ اور پنجاب ہی کی ایک جماعت کے چند اشتہارات و مضامین کے جواب میں لکھے گئے ہیں۔ مولانا موصوف نے قرآنی آیات سے قربانی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور منکرین قربانی کے اعتراضات و شکوک کا نہایت مسکت جواب دیا ہے۔ جو لوگ قربانی کے اقتصادی پہلو اور اس کے روحانی فلسفہ کو سمجھنا چاہیں وہ اس رسالہ کو ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

تبصرہ بر تذکرہ:۔ ناشر مہتمم حلقۂ دعوت و ارشاد۔ تقطیع ۱۸×۲۲/۸ حجم ۴۴ صفحے کاغذ اور کتابت وطباعت معمولی۔ قیمت مع محصول ڈاک ۲/

مسٹر عنایت اللہ مشرقی کے "تذکرہ" کا نام اخبارات و رسائل میں بارہا آچکا ہے۔ یہ کتاب جب شائع ہوئی، علمائے اسلام نے اس کے ملحدانہ خیالات کی مخالفت کی۔ اخبارات و رسائل میں اس کے خلاف مضامین نکلے۔ جا بجا جلسوں میں اس کے خلاف نفرت کے ریزولیشن پاس ہوئے۔ اسی زمانہ میں چودھری محمد حسین صاحب ایم۔ اے لاہوری کے قلم سے اخبار زمیندار کی کئی اشاعتوں میں اس کتاب پر ایک مفصل تبصرہ شائع ہوا۔ جو بروقت بہت پسند کیا گیا۔ اس کے بعد سے اس کتاب کا چرچا مدہم پڑ گیا۔ لیکن ادھر ڈیڑھ ایک سال سے عنایت اللہ صاحب نے پھر کروٹ لی اور ایک نئی تحریک تحریک خاکسار کے نام سے شروع کی۔ اور اس تحریک کے پردہ میں اس کتاب کو بھی پھیلنے کے مواقع ملے۔ اس لئے ضرورت ہوئی کہ اس کی طرف پھر توجہ کیجائے۔ چنانچہ حلقہ دعوت و ارشاد نے چودھری محمد حسین صاحب کے تبصرہ کے منتشر اجزا کو کتابی صورت میں شائع کرکے مسلمانوں کی ایک مفید خدمت انجام دی ہے۔

یار غار:۔ مولفہ مولوی محمد ظفر صاحب۔ ایم، اے، ایل، ایل، بی وکیل۔ تقطیع ۱۸×۲۲/۱۶ حجم ۶۴ صفحے کاغذ اور کتابت وطباعت معمولی قیمت مع محصول ڈاک ۱/ ملنے کا پتہ:۔ انجمن رفیق الاسلام گوڑگانوہ (پنجاب)

انجمن رفیق الاسلام ایک خاموش تبلیغی انجمن ہے۔ اسلام کی عام اشاعت اور مسلمان بچوں کی اخلاقی حالت درست کرنے کی غرض سے عام فہم زبان میں چھوٹی چھوٹی کتابیں شائع کرتی رہتی ہے۔ جو نہایت مفید ہوتی ہیں۔ الاصلاح کی کسی گذشتہ اشاعت میں اس انجمن کی دو کتابوں کا تعارف ہو چکا ہے۔ یار غار بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حالات زندگی اختصار و جامعیت کے ساتھ نہایت آسان زبان میں لکھے گئے ہیں۔ مسلمان بچوں اور بچیوں اور عام

مسلمانوں کے پڑھنے کے لئے یہ ایک مفید کتاب ہے۔ خوبیوں کے باوجود قیمت کچھ نہیں ہے صرف محصول ڈاک کیلئے ٹکٹ بھیجکر مفت مل سکتی ہے۔

ادب لطیف افسانہ نمبر:۔ مرتبہ چودھری برکت علی صاحب بی۔ اے و مرزا ادیب صاحب بی۔ اے حجم ۱۶۰ صفحات، کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت بہتر۔ قیمت افسانہ نمبر ۱۲ر سالانہ للعہ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ اردو، لاہور

ادب لطیف ایک اچھا رسالہ ہے ماہ جون و جولائی کی مشترکہ اشاعتوں میں اس نے اپنا افسانہ نمبر شائع کیا ہے۔ منظوم و منثور دونوں قسم کے مضامین ہیں اور اکثر عمدہ۔ افسانہ نویسی پر بھی چند مختصر مضامین ہیں۔

پیش نظر افسانہ نمبر کو چند تصاویر سے بھی مزین کیا گیا ہے۔ ان میں دو ایک آرٹ کا اچھا نمونہ ہیں۔ صوری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے یہ نمبر کامیاب ہے۔ اور اس کے کارکنوں کی کوشش لائق تحسین۔

پیغام حق:۔ مرتبہ سید محمد شاہ صاحب ایم۔ اے تقطیع ۲۰×۲۶/۸ حجم ۳۲ صفحے کاغذ معمولی کتابت و طباعت عمدہ۔ قیمت سالانہ عہ/۔ مقام اشاعت:۔ ظفر منزل۔ تاجپورہ، لاہور۔

یہ ایک مذہبی رسالہ ہے۔ ابتک اس کے تین نمبر شائع ہو چکے ہیں ہر نمبر میں مذہب اور مسلمانوں کی عام اصلاح کے متعلق بعض مفید مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ثلاثیات کے عنوان سے اس کا ایک مستقل باب ہے جسمیں ایسی حدیثوں کے ترجمے درج کئے جاتے ہیں جنمیں صرف تین باتوں کا ذکر ہوتا ہے۔ اس کے تیسرے نمبر میں "کانگریس کی الٹی برکات" کے عنوان سے جو مقالہ افتتاحیہ لکھا گیا ہے وہ بالکل لغو ہے۔ مسلمانوں کی مذہبی خدمت کے معنی اگر یہ ہیں کہ ان کے فطری جذبات و داعیات کو کچلا جائے اور انکو غلامی و بزدلی کی تعلیم دیجائے۔ تو ہمارا ان مذہبی ناصحوں پر افسوس ہے۔

پیمانہ: ناظر ساغر نظامی۔ مرتب صہبا۔ تقطیع ۲۲×۱۸ حجم ۵۰ صفحے۔ کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت سالانہ عمر پتہ:۔ ادبی مرکز، میرٹھ

ساغر کا پیمانہ متعدد بار گردش کر چکا ہے لیکن شوخی قسمت سے اسے دوام بہت کم نصیب ہوا۔ ایکے جو پیمانہ ہمارے سامنے ہے دیکھنے میں تو خوبصورت ہے لیکن بہت چھوٹا۔ رندان قدح خوار کی اس سے کیا تسکین ہوگی پھر اب اسمیں وہ تندوتلخ بادہ نظر نہیں آتی جو ساغر صاحب کا مخصوص فیضان تھی۔ اب انھوں نے شراب کے نام سے حریفان بزم کو کوئی سرخ شربت ہی پلا دینا چاہا ہے۔

(ع۔ن)

[illegible]

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۹۰۲

دائرہ حمیدیہ کی اعانت

دائرہ حمیدیہ کی خدمت و اعانت، کتاب الٰہی کی خدمت و اعانت ہے۔ اس کی اعانت کی تین صورتیں ہیں۔

۱۔ جو حضرات سو روپے یکمشت دائرہ کو عنایت فرمائیں گے وہ دائرہ کے معاون دائمی متصور ہوں گے۔ ان کو دائرہ کا رسالہ "الاصلاح" اور تمام مطبوعات برابر ہدیۃً دی جائیں گی۔

۲۔ جو حضرات پچاس روپیہ یکمشت عنایت فرمائیں گے۔ ان کو رسالہ الاصلاح اور دائرہ کی دوسری مطبوعات برابر نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

۳۔ جو حضرات دس روپے سالانہ عنایت فرمائیں گے ان کی خدمت میں الاصلاح ہدیۃً جاری کیا جائے گا اور سال بھر کی مطبوعات بلا قیمت بھیجی جائیں گی۔

ہدایات و قواعد

۱۔ الاصلاح ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ تک شائع ہوگا۔

۲۔ اگر مہینہ کے آخر تک پرچہ نہ پہنچے، فوراً دفتر کو لکھ کر منگوا لیجئے ورنہ بقیمت بھیجا جائے گا۔

۳۔ مضامین وغیرہ اڈیٹر کے نام بھیجئے اور دفتر سے متعلق امور کے لئے تمام خط و کتابت منیجر سے کیجئے۔

۴۔ دفتر سے خط و کتابت کرنے میں خریداروں کو نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہئے۔

۵۔ چندہ سالانہ چار روپے۔ بیرون ہند کے لئے چھ روپے۔ فی پرچہ چھ آنے

عبدالاحد اصلاحی منیجر دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ

عبدالاحد طابع و ناشر نے اصلاح پریس ملک مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ میں چھاپ کر شائع کیا

الاصلاح

دائرہ حمیدیہ کا ماہوار علمی و مذہبی رسالہ

مرتبہ

امین احسن اصلاحی

تصنیفات استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

تفسیر نظام القرآن

جن کو اللہ تعالیٰ نے کتاب الٰہی کے سمجھنے کا صحیح ذوق بخشا ہے۔ ان کا اتفاق ہے کہ سو وقت تک حضرت استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی کی تفسیر نظام القرآن سے بڑھکر کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی۔ اس تفسیر نے قرآن کی تمام مشکلات حل کر دی ہیں۔ استاذ امام کا طریقۂ تفسیر یہ ہے کہ پہلے سورہ کا عمود یعنی عنوان بحث بتلاتے ہیں پھر آیات کا باہمی نظم اور سابق و لاحق سے سورہ کا تعلق واضح کرتے ہیں۔ اس کے بعد سورہ کے تمام مشکل الفاظ اور مشکل اسالیب کو ایک ایک کر کے لیتے ہیں اور کلام عرب کی روشنی میں ان کو بے نقاب کرتے ہیں۔ پھر سورہ کے فلسفہ و اسرار اور غوامض و حکم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور صحیح نقل و صحیح عقل کی روشنی میں عجائب قرآن اور حکم کتاب الٰہی کو اس طرح کھولتے ہیں کہ منکر سے منکر بھی قرآن کی بے پایاں عظمت کے سامنے سر جھکا دیتا ہے۔ اس عظیم الشان تفسیر کے مندرجہ ذیل اجزا چھپ چکے ہیں۔ اہل علم ان کی قدر کریں تاکہ بقیہ کی طبع و اشاعت کا سامان ہو۔

تفسیر سورۃ الذاریات:۔ اس کتاب میں مولانا کی عام خصوصیات تفسیر کے علاوہ چند باتیں مخصوص اہمیت رکھتی ہیں۔ اس میں مصنف نے اپنے نظریہ کے مطابق ابتدا کی قسموں کا عمود سورہ (دینونت) سے تعلق نہایت وضاحت کے ساتھ دکھلایا ہے۔ اسی ضمن میں تمام امم معذبہ مذکورہ قرآن کے اسباب ہلاکت کی تفصیل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقوام معذبہ کی ہلاکت میں ہوا کے تصرفات کو کتنا دخل رہا ہے بنی اسرائیل کے مصر سے خروج کے وقت موقع عبور کی عظیم الشان تحقیق بھی اس ضمن میں آگئی ہے۔ "نطق" سے معاد اور "خلق زوجین" سے معاد اور رسالت پر استدلال کے جو پہلو بیان ہوئے ہیں انکی قدر صرف اہل ذوق کر سکتے ہیں۔

قیمت:- ۶ر (باقی سرورق صفحہ ۳ پر ملاحظہ ہو)

جامعہ نگر (دہلی)

جلد ۲	ماہِ رجب ۱۳۵۶ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۳۷ء	نمبر ۱

فہرست مضامین

شذرات

ایک مخدوم بزرگ اپنے والا نامہ میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"مدت سے خیال تھا کہ سیرت حمیدیہ پر آپ کو توجہ دلاؤں۔ مولانا کا ورع و تقویٰ اس زمانہ میں آپ اپنی نظیر تھا۔ ضروری ہے کہ ان چیزوں کے نمونے آپ حضرات کے قلم سے الاصلاح میں برابر نکلتے رہیں۔"

یہ خیال عرصہ سے سامنے ہے اور بار بار جی میں آیا کہ یہ سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ لیکن مولانا کی زندگی کا بڑا حصہ ہم لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہے۔ حیدر آباد سے ترک تعلق کے بعد انھوں نے یہاں مستقلاً قیام شروع کیا اور ہم لوگوں کی صحبت و ملازمت کا زمانہ شروع ہوا اس سے پہلے کے تمام حالات زیادہ تر انکے صرف ان احباب و تلامذہ کو معلوم ہیں جو (لہ آباد) کراچی اور حیدر آباد میں ان سے وابستگی رکھتے تھے۔ مولانا کی گفتگوئیں ہمیشہ علمی مباحث پر ہوتی تھیں۔ زندگی کے عام احوال و واقعات کا ذکر کبھی شاذ مشکل ہی سے کرتے۔ اس وجہ سے بھی ہم لوگ ان کی پچھلی زندگی کی سرگذشتوں سے کچھ واقف نہ ہو سکے۔ ان اسباب سے جب جب مولانا کی سیرت کا خیال سامنے آیا طبیعت ہچک گئی۔ لیکن یہ کام کرنا ہے۔ مولانا کے اکثر مخلصین کا تقاضا اسکے لئے اصرار کی حد تک بڑھ گیا ہے۔ پھر ایک ایسی زندگی جو اپنے اندر اتنے معانی رکھتی ہو ہمارے لئے ایک بہترین علمی و عملی سرمایہ ہے اور اس کے بصیرت بخش حالات دنیا کے موجودہ دور میں جبکہ زندگی کے اچھے نمونے مشکل ہی سے کبھی دیکھنے کو ملتے ہیں، ہم کو بیشمار فائدے پہنچا سکتے ہیں۔ پس جی چاہتا ہے کہ الاصلاح کے صفحات میں یہ کام شروع کر دیا جائے، اگر مرتب اور مفصل حالات نہیں ملتے تو جو متفرق حالات سامنے ہیں وہی جمع کر دئے جائیں، ممکن ہے اس طرح مولانا کے دوسرے احباب و تلامذہ کو بھی توجہ ہو اور وہ بھی اپنی معلومات سے فائدہ پہنچانے کی کوشش کریں اور

آہستہ آہستہ مولانا کی مفصل سوانح حیات لکھنے کے لئے مواد فراہم ہو جائے۔

مولانا سے واقفیت رکھنے والے جن بزرگوں کی نگاہوں سے یہ سطریں گذریں ان سے التماس ہے، کہ وہ اس سلسلہ میں ہماری مدد کریں۔ اگر کوئی خاص مشغولیت مانع نہ ہوئی تو ان شاء اللہ آئندہ اشاعت سے یہ کام کسی نہ کسی شکل میں شروع ہو جائے گا۔ والامر بید اللہ۔

مولانا سید صبغۃ اللہ صاحب حسینی بختیاری (فاضل دیوبند) استاذ جامعہ دارالسلام عمرآباد نے مندرجہ ذیل تحریر اپنے ایک گرامی نامہ کے ساتھ الاصلاح میں اشاعت کے لئے ارسال فرمائی ہے۔

"ہندوستانی زبان اور تفسیر قرآن"

کے موضوع پر ایک کتاب کی ترتیب و تدوین ہو رہی ہے جس میں ان تمام مصنفین و مؤلفین کا تذکرہ ہوگا جنھوں نے "ہندوستانی" (اردو) میں قرآن عزیز کی کوئی خدمت کی ہو خواہ مستقل تفسیر ہو، یا کسی تفسیر کی عربی کتاب کا ترجمہ ہو یا کسی قرآنی مسئلہ پر کوئی تالیف ہو، وہ اپنا مختصر تذکرہ اپنی کتاب کے ہمراہ روانہ فرمائیں تاکہ ہم کو اپنی کتاب میں درج کرنے کا موقع ملے۔ اہل علم سے توقع ہے کہ وہ ضرور قرآن اور "ہندوستانی" کی خدمت میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔

معتمد دائرہ قرآنیہ، عمرآباد، ضلع شمالی ارکاٹ

جامعہ دارالسلام کے محترم اساتذہ قرآن مجید کی خدمت میں جس جوش سے حصہ لے رہے ہیں اس پر وہ تمام مسلمانوں کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ اردو زبان اب قرآنی علوم و معارف سے ناآشنائے محض نہیں کہی جا سکتی۔ قدیم تحقیقات کے علاوہ بہت سی ایسی چیزیں بھی قرآن مجید سے متعلق اردو میں آگئی ہیں جو اس کی مخصوصات میں سے ہیں۔ اور اگر پورے لٹریچر کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو کہ اردو میں قرآن مجید پر فکر و نظر کے مختلف اسکولوں کی اچھی خاصی ترجمانی ہوگئی ہے پس اگر کوئی ایسی کتاب لکھی جائے جس میں

ابتداء سے لیکر اس وقت تک کی تمام کوششوں کے متعلق ضروری معلومات یکجا ہوجائیں تو یہ قرآن مجید اور اردو زبان دونوں کی ایک نہایت قابل قدر خدمت ہوگی۔ پس ہم امید کرتے ہیں کہ ارباب علم اس معاملہ میں دائرہ قرآنیہ کی پوری مدد کریں گے۔

موصوف ان لوگوں کی بھی فہرست معلوم کرنا چاہتے ہیں جنھوں نے استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی سے استفادہ کے بعد، اردو زبان میں قرآن کی کوئی خدمت کی ہے۔ ہم کو اس بارہ میں معلومات نہیں ہیں۔ امید ہے مولانا کے تلامذہ خود ضروری معلومات سے بختیاری صاحب کو مطلع کریں گے۔

فلسطین کے متعلق آجکل جو خبریں اخبارات میں آرہی ہیں ان کو پڑھکر مسلمانوں کی بیکسی پر کون دل ہے جو تڑپ نہ جاتا ہوگا۔ لیکن فلسطین سے زیادہ ہماری ابتری اور پراگندگی کا معاملہ دردانگیز ہے۔

ہندوستان میں رہکر ہم کر ہی کیا سکتے تھے، لے دیکے سارا زور صدائے احتجاج کے جلسوں اور تجویزیں پاس کردینے والی کانفرنسوں تک محدود تھا۔ مگر اولاً تو ہمتوں پر موت طاری ہو تا نیا اگر شاذ شرمی میں بعض لوگ کچھ نمائش کرنا بھی چاہتے ہیں تو اغراض کا شیطان بیچ میں کود پڑتا ہے اور نمائش کا رہا سہا ڈھونگ بھی بگڑ جاتا ہے۔ ایک جماعت اگر اعلان کرتی ہے کہ فلاں تاریخ کو جلسے کئے جائیں، صدائے احتجاج بلند کیجائے، دعائیں کی جائیں تو دوسری جماعت اٹھکر اس پر خط نسخ پھیر دیتی ہے اور ایک دوسری تاریخ اور ایک نئے پروگرام کا اعلان شایع کردیتی ہے۔ ایک جماعت کسی شہر میں ایک آل انڈیا فلسطین کانفرنس کا اعلان کرتی ہو تو دوسری جماعت اسی شہر میں پہنچکر دس دن پہلے ہی ایک آل انڈیا کانفرنس رچالیتی ہے۔ یہ قوم ہے جو قرآن پر ایمان رکھتی ہو اور محمد رسول اللہ کی امت میں شامل ہے!! اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ۝

ہماری قوم نے یہ ترقی اس وقت کی ہو جب برسوں سے ہندوستان کی گلی گلی میں تنظیم تنظیم کے ہنگاموں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اور جبکہ مصائب شدائد کے احساس نے دنیا کی نالائق سے نالائق قوموں میں بھی

نہ صرف یکجہتی اور یگانگت کا احساس پیدا کر دیا ہے بلکہ ان کو بنیان مرصوص سے زیادہ محکم اور ٹھوس بنا دیا ہے۔ ابتک جب ہم مسلمانوں کی تباہی و بربادی کی کوئی مثال ڈھونڈنا چاہتے تھے تو یہود کو یاد کر لیا کرتے تھے کہ مسلمان اسطرح تباہ و برباد ہو گئے جس طرح یہود لیکن اب اپنی نالائقیوں کیلئے کوئی مثال تلاش کرنا چاہیں تو دنیا کے کس گوشہ میں جائیں!۔ وہی یہود جو کل تک مغضوب و ملعون تھے، اور جنکی مقدس زمین ان کی نااہلیت کی وجہ سے معراج کی شب میں ہمارے سپرد کی گئی اب ایک زندہ اور طاقتور قوم بن گئے اور اپنی جگہ انھوں نے ہمارے لئے خالی کر دی اور دنیا کی تاریخ کا یہ عبرت انگیز تماشہ ہمارے حصہ میں آیا ہے کہ جو چیز ہم نے خدا کے ہاتھوں سے پائی تھی، برطانوی اقتدار کا ہاتھ اٹھا ہے کہ اسکو ہم سے چھین کر یہودیوں کے ہاتھ میں دیدے اور ہمارے رہنماؤں کا حال یہ ہے کہ

خانۂ شرع خراب است و ارباب صلاح
در عمارت گری گنبد دستار خوداند

گانگرس میں مت شریک ہو جو، وہ کفار کی جماعت ہے اور کفار کے ساتھ شرکت عمل حرام۔ وہ روٹی کی طمع دلاکر ہماری تمام اولوالعزمیوں کو پامال کر دینا چاہتی ہے اور وطن کو معبود بنا کر مسلمانوں کے عالمگیر نصب العین کو چھین لینا چاہتی ہے۔ ایسی جماعت گردن زدنی ہے۔ مسلمانوں کو صرف دین کی خدمت کرنی چاہئے اور اللہ کیلئے سربکف ہونا چاہئے۔ لیکن کیا یہ اللہ کا معاملہ نہیں ہے؟ کیا فلسطین کی سرزمین ہمارا دینی مرکز نہیں ہے؟ کیا اسکی مقدس مسجد ہمارا قبلۂ اولیٰ نہیں ہے؟ کیا وہ ان تین مساجد میں سے ایک نہیں ہے جنکے لئے ہم شد رحال کر سکتے ہیں اور پھر کیا وہ حرم نہیں ہے جسکی حرمت کی حفاظت و صیانت سے بے پروا ہو کر ہم مسلمان نہیں رہ سکتے؟ کیا فاروق اعظم رضی کے کارنامے ہمکو فراموش ہو گئے؟ کیا صلاح الدین کی تلوار اس سرزمین کی حفاظت کیلئے نہیں چمکی! اور کیا یہ جھوٹ ہے کہ اس مجاہد اعظم اور محافظ ناموس و حرمت اسلام نے عین اس مقدس رات میں اس گھر کو نصاریٰ کے ہاتھوں سے چھینا جس مقدس رات میں اس گھر کی حفاظت و تولیت کی عظیم الشان امانت سرور کونین کو تفویض ہوئی؟ کیا ہماری تاریخ اور روایات کے

یہ تمام اوراق پارہ پارہ ہوگئے؟ پھر وہ مسلم لیگ کہاں ہے جو اس عہد میں ہمارے دین و مذہب کی تنہا پاسبان ہے۔ آخر وہ اسلام کی حفاظت کیلئے کیوں نہیں اٹھتی!۔ کیا اس معاملہ کو اتنی اسلامی اہمیت بھی حاصل نہیں ہے جتنی جھانسی کے الکشن کو حاصل تھی؟ اور ہمارے مسٹر جناح کہاں ہیں جنہوں نے شملہ میں فرمایا کہ وہ اسلام کی حرمت کیلئے توپوں کے دہانوں سے بھی نہیں ڈرینگے؟ آخر اُن کے خروج کیلئے بدقسمت مسلمان کب تک راہ دیکھیں!

افسوس ہے کہ اس معاملہ میں جمعیتہ علمائے ہند نے بھی نہایت افسوسناک غفلت سے کام لیا۔ حالانکہ یہ کام اسی کے کرنیکا تھا۔ پارسال دہلی میں جو فلسطین کانفرنس ہوئی اس نے اولاً تو کوئی عملی پروگرام ہی مسلمانوں کے سامنے نہیں رکھا اور اگر چند تجویزیں پاس بھی کیں تو ان کیلئے ایک دن بھی عملی کام نہیں ہوا۔ الٰہ آباد میں جو کانفرنس ہوئی اس نے صرف صدائے احتجاج کا ریزولیشن پاس کیا اور عملی تجاویز کے معاملہ کو ایک مستقبل مجہول میں ہونیوالی کانفرنس کیلئے اٹھا رکھا اور اس صدائے احتجاج کیلئے بھی ملک میں کوئی باقاعدہ اور مؤثر پروپیگنڈا نہیں کیا گیا۔ ان واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارا دل اور دماغ دونوں مردہ ہوگیا ہے۔ ہم میں اولاً تو اپنے ملی مصائب کا صحیح احساس ہی نہیں ہے اور اگر ہے تو دماغ اسکے تدارک کی عملی تجاویز سوچنے سے عاجز و مفلوج ہے فلسطین کے حالات اول روز سے ایک ہی رخ پر ہیں۔ اور جو لوگ تھوڑی بہت بھی سیاسی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں وہ جانتے تھے کہ رائل کمیشن کس نتیجہ تک پہنچنے والا ہے لیکن ہمارے ارباب سیاست نے، جو صرف حیلوں اور بہانوں کی تلاش میں رہتے ہیں جونہی سن پایا کہ ایک کمیشن معاملات کی تحقیق کر رہا ہے مطمئن ہو بیٹھے کہ اب آسمان سے خدا کی عدالت اتر آئی اور وہ ضرور مسلمانوں کے ساتھ انصاف ہی کریگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے مسلمان بالکل ہی بھول گئے کہ دنیا میں فلسطین نامی کوئی سرزمین بھی ہے اور اسکے لئے انھیں کچھ کرنا بھی ہے۔ یہاں تک کہ موجودہ حالات پیش آگئے۔

جو مسلمان وزارت کے قلمدانوں اور اسمبلیوں کی کرسیوں پر متمکن ہیں، ان سے ہمکو کچھ کہنا نہیں ہے وہ دمشق اور بغداد کا تخت و تاج پاگئے اور اب وہ مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو پھر واپس لائے بغیر تو وہاں سے ٹلتے نہیں!۔ ان کو

گورنر و ں نے سمجھا دیا ہی کہ فلسطین تمہاری حدود انتظام کے اندر شامل نہیں ہی، اور یہ حقیقت اس درجہ واضح ہی کہ وہ اسکا کسی طرح انکار نہیں کر سکتے۔ لیکن ان معصوموں سے کوئی پوچھے کہ اگر کل کو کوئی قوم خدانخواستہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ (حرسہما اللہ) پر گولہ باری کرے اور وہاں کے تمام علماء و مشائخ کو پکڑ پکڑ کے سسلی اور مالٹا کے جزیروں میں بند کرنا شروع کرے اور تم اس پر صدائے احتجاج بلند کرنے کی اجازت مانگو اور وہ کہدیں کہ حجاز تمہاری حدود انتظام میں داخل نہیں ہی تو اس وقت تم کیا کروگے؟ کیا اسی طرح چپ ہو بیٹھو گے؟ اگر نہیں تو وہ راہ عمل بتلاؤ جو اس وقت اختیار کروگے؟ اور پھر یہ بتلاؤ کہ وہ راہ عمل تمہاری لئے آج کیوں بند ہی؟ کیا مسلمانوں کے قبلہ اولی کی حرمت تمہاری نگاہوں میں اتنی بھی نہیں ہی جتنی ان نام نہاد اسمبلیوں کی کرسیوں کی۔ کیا یہ حقیقت معلوم نہیں ہی کہ جو قوم کرسیوں اور جھوٹی عزتوں کیلئے اپنی حرمت و ناموس کی پروا نہیں کرتی اسکی تاریخ میں ایک دن وہ بھی آتا ہے کہ وہ بھیک کے ٹھیکروں پر فخر کرتی ہے اور دوسروں کی گالیوں پر خوش ہو کر ناچتی ہے۔ پس کیا تم بھی اسی روز سعید کے منتظر ہو! اس دنیا کا ایک قانون ہی، جو ہی تو بہت پرانا مگر اب تمہاری لئے دنیا کی کونسی بات ہی جو نئی اور انوکھی نہیں ہوگئی ہی۔ وہ قانون یہ ہی کہ خدا جو کچھ ہمیں دیگا ہماری عزم و حوصلہ کے پیمانہ سے ناپ کر دیگا۔ جب تم خدا کے کلمہ کے اعلاء کیلئے ہفت اقلیم کی بادشاہت کو بھی بال مگس کے برابر سمجھتے تھے اس وقت تمہارا رتبہ یہ ہوا کہ تمہاری ہاتھوں سی خدا نے اونٹوں کی مہارنی اور سارے عالم کی سیادت کی زمام دیدی اور اب کہ تمھیں غلام ہندوستان کی کرسیاں تمہاری قبلہ اولی کی حفاظت وصیانت سے زیادہ عزیز ہوگئی ہیں، ایکدن آئیگا کہ تم اپنی بدبختی پر سر پیٹوگے اور کوئی نہ ہوگا جو تمہاری حالت پر دو آنسو بہا دے۔

توفیق باندازۂ ہمت ہی ازل سے
آنکھوں میں ہی وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

ابھی کل کی بات ہی، لاہور میں حکومت ہند ایک مذبح بنوا رہی تھی۔ اور بالکل ٹھیک بنوا رہی تھی۔ ہندوؤں کو اعتراض کا کوئی حق نہ تھا معاملہ کی مذہبی نوعیت یہ تھی کہ ہندوستان کی حکومت کو گائے کی عبادت سے

انکار ہے اور اسکی فوجی چھاؤنیوں میں گائے کا گوشت ہمیشہ استعمال کیا گیا ہے اور برابر استعمال کیا جائیگا۔ اور اقتصادی حیثیت یہ تھی کہ یقیناً اس مذبح کی تعمیر سے گوناگوں فوائد تھے، حکومت کوئی مسرفانہ کارروائی نہیں کر رہی تھی لیکن مذبح کا نام سنتے ہی ہندو قوم کی پیشانی پر شکن پڑ گئی۔ نتیجہ کیا ہوا؟ یہ ہوا کہ ہندوستان کی وہ حکومت جس کا حاکمانہ گھمنڈ جلیانوالہ باغ میں سیکڑوں ہندوستانیوں کے قتل عام سے بھی نہیں جھجھکا، اس چین جبیں سے سہم گیا۔ اور ساری تجویز ختم کر دیگئی۔

اس واقعہ پر اگر غور کرو تو اس کے اندر عبرت و بصیرت کی اتنی داستانیں ہیں کہ بس یہی ایک واقعہ تمہاری آنکھیں کھول دینے کیلئے کافی ہو سکتا ہے۔ یقیناً یہ انگریزی حکومت وہی ہے جو آج سے دس برس پہلے تھی، دوسری نہیں ہو گئی ہے۔ لیکن کیا بات ہے کہ اب اپنی آن سے زیادہ اسکو اپنی محبوب رعایا کے جذبات کا احترام زیادہ عزیز ہو گیا ہے؟ اس ہندوستان کی پچھلی تاریخ کے بہت سے واقعات تمہیں یاد ہوں گے، جب حکومت کے ارادوں اور پبلک کے جذبات میں آویزشیں ہوئی ہیں، کیا اس سے پہلے بھی حکومت ہند کے آہنی ارادوں کی لینت اور لچک کا یہی عالم تھا؟ پھر جو ارادہ اتنا سرکش اور تنک مزاج تھا، تا او دفعۃً اسقدر حلیم اور بردبار کیوں ہو گیا؟۔

یہ اسلئے ہوا کہ ہندو قوم اب بالکل بدل چکی ہے۔ اس میں اب ایک زندہ اور حساس قوم کی صفات پیدا ہو چکی ہیں۔ وہ موحد نہیں ہے اور اس کا نصب العین بھی کچھ اونچا نہیں ہے لیکن وہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک زنجیر کی کڑیوں کی طرح جڑ چکی ہے۔ اس میں "مادر وطن" کے لئے ایثار، قربانی، فدویت کے وہ اعلیٰ صفات و جذبات پیدا ہو چکے ہیں جو ہم میں خدا اور رسول کیلئے نہیں ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چونکہ وہ خود بدل گئے ہیں اسلئے اب دنیا بھی ان کیلئے بدل گئی ہے۔ اب انکی ہر چیز عزیز و محترم ہے اور ہماری ہر چیز بے وزن و بے قیمت۔ فَاعْتَبِرُوْا یَآ اُولِی الْاَبْصَارْ

ایک دوست تحریر فرماتے ہیں:۔

"پنجاب کے ایک معزز رسالہ نے لکھا ہے "دھوپ کھانا" غلط محاورہ ہے۔ مجھے بھی عرصہ سے یہ محاورہ کھٹک رہا تھا مرزا غالب سے بھی یہ غلطی ہو گئی ہے۔

آگ تاپے کہاں تلک انساں
دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار

عزیز"

معارف قرآن

تفسیر سورۂ عبس

(۲)

تالیف استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ
ترجمہ امین احسن اصلاحی

ایک غلط فہمی کا ازالہ

۵ مجاہد سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم سرداران قریش میں سے کسی سے تخلیہ میں باتیں کر رہے تھے، آپ نے اس کے سامنے اسلام پیش کیا تھا اور توقع تھی کہ وہ قبول کرے گا کہ اسی بیچ میں حضرت عبداللہ بن ام مکتوم پہنچ گئے۔ آنحضرت کی نظر پڑی تو آپ کو ان کا ایسے وقت میں آنا ناگوار ہوا کہ یہ قریشی کہے گا کہ محمد کے پیرو اسی قسم کے اندھے بہرے اور غریب و بے نوا لوگ ہیں۔ اس پر یہ آیت اتری۔

یہ تاویل حضرت مجاہد کی تاویل ہے۔ اور جیسا کہ ہم پچھلی فصل میں بیان کر چکے ہیں، قرآن مجید کے الفاظ سے یہ بالکل ظاہر ہے۔ لیکن بعض لوگوں کو اس واقعہ کے بارہ میں بعض غلط فہمیاں ہوگئی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ابن ام مکتوم نے آنحضرت صلعم سے تعلیم وارشاد کی درخواست کی اور آپ نے ان سے اعراض فرمایا اس پر یہ عتاب نازل ہوا اور اس قول کو وہ بعض اکابر سلف سے منسوب کرتے ہیں۔ چنانچہ بعضوں نے حضرت عائشہ رض سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت کسی قریشی سردار سے باتیں کر رہے تھے کہ اسی بیچ میں ابن ام مکتوم رض نے پہنچکر درخواست کی کہ مجھے کچھ نصیحت فرمایئے۔ ان کی یہ بے موقع درخواست آپ کو ناگوار ہوئی اور یہ آیت اتری۔ بعض لوگ، نبی حضرت عائشہ رض سے روایت کرتے ہیں کہ مجلس میں ابوجہل اور عتبہ بن ربیعہ جیسے

صناد ید شریک تھے بعض لوگ حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلعم عتبہ بن ربیعہ، عباس بن عبد المطلب، ابوجہل بن ہشام سے باتیں کر رہے تھے کہ ابن ام مکتوم نے آکر درخواست پیش کی کہ علمنی مما علمک اللہ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو علم بخشا ہے اس میں سے کچھ مجھے بھی سکھائیے۔ آپ کو ان کی یہ بے محل مداخلت ناگوار ہوئی اور اس پر یہ عتاب نازل ہوا بعض لوگ حضرت ضحاک سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت اشراف قریش میں سے کسی سے گفتگو فرما رہے تھے کہ ابن ام مکتوم پہنچے اور انھوں نے اسلام کے متعلق بعض باتیں پوچھیں۔ بعض روایات میں ہے کہ ابن ام مکتومؓ ایسے وقت میں آنحضرت صلعم کے پاس پہنچے کہ آپ عتبہ وشیبہ سے باتیں کر رہے تھے۔ ایک اور روایت ابو مالک سے ہے کہ آپ کی گفتگو امیہ بن خلف سے تھی بعض لوگوں نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلعم ابی بن خلف سے باتیں کر رہے تھے۔

ان تمام روایات پر غور کرنے سے ایک امر واضح ہے کہ یہ سب ایسے لوگوں تک پہنچی ہوتی ہیں جنھیں سے کوئی بھی شریک واقعہ نہ تھا۔ پس اگر ان کی صحت تسلیم بھی کر لی جائے تو بھی ان کی نوعیت استنباط کی ہو گی، خبر کی نہ ہوگی۔ پھر ان میں باہم گر اسقدر اختلاف ہے کہ ان کی حیثیت صرف اوہام کی رہ جاتی ہے۔ واہمہ نے ایک تاویل اختراع کی اور جھٹ اس کے لئے ایک قصہ کا جامہ تراش لیا گیا اور اس کی نسبت ان لوگوں کی طرف کر دی گئی جن کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ باعتبار سند یہ تمام روایتیں نہایت ضعیف ہیں۔ ان میں سے ایک بھی قابل اعتماد نہیں۔ اور قرآن مجید سے بوجوہ ذیل ان کا غلط ہونا آشکارا ہے۔

(۱) آیت کے الفاظ میں یہ کہیں نہیں ہے کہ آنحضرت صلعم نے نابینا کو دیکھکر تیوری چڑھائی یا اس کے سامنے ترش رو ہوئے (جیسا کہ بعضوں نے کہا ہے) اور اگر آپ ایسا کرتے بھی تو ایک نابینا کو اس ترش روئی کا کیا احساس ہوتا! آپ کی آزردگی کا باعث محض ڈرکا آنا تھا کیونکہ اس سے ان سرکشوں کو موقع ملتا تھا کہ آنحضرت صلعم کے صحابہ پر طعن کریں اور آپ کی مخالفت کا ایک بہانہ پیدا کر لیں۔ مکی زندگی میں

آنحضرت صلعم کی تمام دعوت کا تعلق، توحید، معاد اور رد شرک سے تھا اور یہ اس درجہ قطعی اور واضح مسائل تھے کہ مخالفین ان کے جواب میں معارضہ کا کوئی پہلو مشکل ہی سے پاتے اس لئے ہمیشہ اس گھات میں رہتے کہ اگر مجادلہ کا کوئی موقع نہیں ملتا تو استہزا و استخفاف ہی کا کوئی نکتہ ڈھونڈھ نکالیں اور یقیناً عبداللہ بن ام مکتوم کے اس موقع پر آجانے سے ان کی یہ غرض پوری ہو رہی تھی۔

۲۔ (وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّىٰ أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنفَعَهُ الذِّكْرَىٰ) اس امر پر نہایت واضح دلیل ہے کہ آنحضرت صلعم کو یہ بات بالکل نہیں معلوم تھی کہ نابینا کا آنا طلب علم اور حصول ہدایت کے لئے تھا۔ اگر یہ بات آپ کو معلوم ہوتی آپ نہایت خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کرتے۔ کیونکہ طلب علم و ہدایت سے بڑھکر پیغمبر کو کوئی چیز محبوب نہیں ہوسکتی۔ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّىٰ کے اسلوب سے یہی بات ٹپکتی ہے۔ کیونکہ اس اسلوب کو اگر خوب پھیلا دو تو پوری بات گویا یوں ہوگی تم آزردہ ہوئے کہ اس کا آنا ایک ایسی حالت میں ہوا جو تمھیں ناپسند ہے حالانکہ تمھیں کیا خبر ممکن ہے وہ اپنے ساتھ کوئی ایسا مقصد لے کر آیا ہو جسمیں تمھارے دل کی اصلی خوشی پوشیدہ ہو؛

غرض قرآن مجید سے یہ کسی طرح ثابت نہیں کہ آنحضرت صلعم کو یہ بات معلوم تھی کہ نابینا کا آنا تعلیم و تذکر کے کسی دینی مقصد کیلئے ہے اور اس کے باوجود آپ نے ناخوشی کا اظہار کیا ہو۔

۳۔ [وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكَّىٰ] سے نہایت واضح طور پر ثابت ہے کہ تبلیغ و دعوت کے معاملہ میں آنحضرت صلعم نے انہماک کی غیر معتدل حالت اختیار کرلی تھی۔ چنانچہ اس پر آپ کو ہدایت ہوئی کہ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو اس کی بازپرس تم سے نہ ہوگی کہ خواہ مخواہ کو ان کے ایمان کے لئے تم ان کے پیچھے پڑے رہو۔ اس مضمون کی آیتیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔ مثلاً لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ۔ تم ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو۔ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَا أَنتَ بِمَلُومٍ ان سے اعراض کرو تم کو کوئی ملامت نہیں فان تولوا فانما علیك البلاغ المبین اگر وہ اعراض کریں تو کچھ غم نہیں تم پر تو صرف کھولکر

پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔

ان آیات کا حاصل مطلب سامنے رکھکر زیر بحث آیت پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ اس میں باندازِ عتاب آنحضرت صلعم کے اس بوجھ کو ہلکا کیا گیا ہے جو تبلیغ و دعوت کے عشق میں آپ نے اپنے سر پر اٹھالیا تھا۔ یقیناً عتاب کا یہ انداز اس عتاب سے بالکل مختلف ہے۔ جو آنحضرت صلعم پر ہونا چاہئے تھا اگر آپ نے واقعتہً کسی کمزور مسلمان سے بربنائے استحقار اعراض کیا تھا۔ پھر اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى کے ٹکڑے سے واضح ہے کہ سرداروں اور اغنیا کے ساتھ آنحضرت صلعم کا یہ اعتنا محض عشق دعوت اور جوش تبلیغ کا نتیجہ تھا، یہ بات نہ تھی کہ آپ غربا کو حقیر سمجھتے رہے ہوں۔

(۴) ان آیات کے بعد والے ٹکڑے یعنی كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ میں اس امر کی کھلی ہوئی تعلیم ہے کہ آنحضرت صلعم ان لوگوں سے بالکل بے پروا ہو جائیں جو اللہ کی یاد سے بے پروا ہوگئے ہیں اور ان کی تالیف و دلجوئی کے لئے ہرگز اسقدر نیچے نہ اتریں جسقدر نیچے اترنا آپنے گوارا فرمایا ہے۔ پھر فرمایا۔ اَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى وَهُوَ يَخْشٰى فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى۔ اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلعم کی اس درجہ مشغولیت آپکی اور کتاب الٰہی کی عظمت کے شایان شان نہیں ہے۔

۵۔ پھر اگر وہ تمام روایتیں تسلیم بھی کرلی جائیں جنمیں بیان کیا گیا ہے کہ ابن ام مکتوم قرآن مجید سیکھنے آئے تھے، یا کوئی مسئلہ پوچھنا چاہتے تھے، یا طلب ہدایت کے لئے آئے تھے جب بھی یہاں کسی واقعی عتاب کا کوئی موقع نہیں ہے۔ آئندہ ہم اس کی مزید توضیح کریں گے۔

خلاصہ اس تفصیل کا یہ ہے کہ ان آیات اور ان کے پیش و عقب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں آنحضرت صلعم کو استغنا اور شایان شان ترفع کی تعلیم دی گئی ہے اور نہایت بلیغ ترین اسلوب عتاب میں آپ کو تبلیغ و دعوت میں مفرط انہماک سے روکا گیا ہے۔ پھر اس میں آنحضرت صلعم کی دلداری، غربا کی دلجوئی اور اغنیا کی توبیخ کے نہایت لطیف پہلو ہیں جو آئندہ مباحث میں سامنے آئیں گے۔

پہلی غلطی سے بڑی غلطی

۶۔ صحیح تاویل کے واضح ہو جانے کے بعد ان باتوں کے ذکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے جو یکسر توہمات پر مبنی ہیں لیکن ہم ایک خاص امر کا ذکر یہاں ضروری سمجھتے ہیں تاکہ یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ کمزور روایات پر اعتماد کرنے سے کیا کیا خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور ان سے کس درجہ احتیاط ضروری ہے۔

حضرت امام رازیؒ نہایت ذہین آدمی ہیں۔ وہ اس بات کو فوراً سمجھ گئے کہ یہاں خفگی اور عتاب کا کوئی موقع نہیں تھا لیکن چونکہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر آنحضرت پر عتاب ہوا اسلئے ان کو فکر ہوئی کہ کسی نہ کسی شکل سے عتاب کا کوئی موقع پیدا کریں، چنانچہ انھوں نے پورے مقدمہ کو ازسرنو مرتب کیا اور پھر جن نتائج تک پہنچے ان کی تفصیل سننے کے قابل ہے۔

وہ پہلے سوال قائم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر آنحضرت صلعم پر عتاب کیوں فرمایا حالانکہ بوجوہ ذیل مستحق زجر و تنبیہ ابن ام مکتومؓ تھے۔

۱۔ مانا کہ ابن ام مکتوم نابینا تھے لیکن وہ سرداران قریش کے ساتھ آنحضرت صلعم کی گفتگو سن کر اس سے معاملہ کی اہمیت کا اندازہ کر سکتے تھے۔ پھر ایسی حالت میں ان کا بیچ میں مداخلت کرنا یقیناً آنحضرت صلعم کی ایذاء کا باعث ہوا ہوگا اور یہ معصیت ہے۔

۲۔ یہ مسلم ہے کہ اس وقت جو اہمیت سرداران قریش کے معاملہ کو تھی وہ اہمیت ابن ام مکتوم کے معاملہ کو نہ تھی۔ ابن ام مکتومؓ بقدر ضرورت رسالت سے فیضیاب ہو چکے تھے اور یہ کفار ہنوز بالکل محروم تھے اس لئے ان سے زیادہ توجہ کے مستحق تھے۔ پھر ان کے اسلام سے بہتوں کے قبول اسلام کی راہ باز ہوتی۔ پس ایسی حالت میں ابن ام مکتومؓ نے مداخلت کر کے اسلام کی ترقی کے ایک نہایت

بیشتر موقع کا خون کیا۔

۳۔ قرآن مجید میں وارد ہے اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَاۗءِ الْحُـجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ
جو لوگ تم کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں اکثر ناسمجھ ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم کو صحابہ کی تادیب و اصلاح کا اختیار حاصل تھا اور آپ برابر مختلف امور پر صحابہ کو زجر و تنبیہ فرمایا کرتے تھے، پھر ایک ایسے امر پر آپ کیوں معتوب ہوئے جس کا آپ کو اختیار حاصل تھا۔

حضرت امام رازیؒ ابن ام مکتومؓ کے مستحق زجر و تنبیہ ہونے کے اتنے وجوہ بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس موقع پر اتنے اشکالات پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے بعد جواب کی تقریر یوں شروع کرتے ہیں۔

ان اشکالات کے دو جواب ہیں۔

اول یہ کہ اگرچہ معاملہ کی اصل حقیقت وہی تھی جو اوپر مذکور ہوئی لیکن اس کی ظاہری شکل سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ آنحضرت صلعم دولتمندوں کو غریبوں پر مقدم کرنا چاہتے ہیں اسلئے آپ پر عتاب ہوا۔

ہمارے نزدیک یہ وجہ ہر چند قبح سے خالی ہے لیکن ضعف سے محفوظ نہیں۔ یہاں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو غیب کو جانتا ہے، اور اس کا عتاب ہمیشہ کسی بات سے روکنے کیلئے ہوتا ہے تو کیا یہاں پیغمبر صلعم کو صحابہ کی تنبیہ سے روکا گیا ہے، حالانکہ اس بات کی آپ کو اجازت حاصل تھی۔

امام رازیؒ کا دوسرا جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کے فعل کے اس ظاہری نتیجہ پر عتاب نہ ہوا ہو بلکہ واقعتہً یہ بات ہوئی ہو کہ قرابت، شرافت، اور علوئے منصب کی وجہ سے آنحضرت صلعم کا دل ان سرداروں کی طرف مائل ہوگیا ہو اور ابن ام مکتومؓ چونکہ اندھے تھے اور رشتہ و قرابت کی کوئی وابستگی بھی آپ سے نہیں رکھتے تھے نیز شرف خاندانی کے اعتبار سے بھی فروتر تھے اس لئے ممکن ہے آپکے دل میں ان سے کچھ نفرت پیدا ہوگئی ہو۔ اور اس پر عتاب ہوا ہو۔

اس دوسرے جواب کی نسبت بجز اس کے کیا کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ حضرت امام رازی پر رحم

فرمائے، ام مکتوم ام المومنین حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کی خالہ تھیں۔ اس تعلق کے بعد شرف و قرابت کی وہ کونسی بلندی باقی رہ گئی ہے جو ان کے بیٹے کو حاصل نہیں ہوگئی۔ پھر یہ کیسی دردانگیز بات ہوگی کہ ایک پیغمبر ایک شخص سے اس لئے نفرت کرے کہ وہ اندھا ہے۔ اندھے سے زیادہ ہمدردی و غمگساری کا حقدار کون ہے۔ اور اگر پیغمبر بھی اس سے نفرت کرے گا تو اس کی دلداری اور محبت کے لئے کون آئے گا! یہ بات تو ایک مومن کی شان سے بھی فروتر ہے۔ نبی اور رسول کا کیا ذکر!

غور کرو، معاملہ کی نوعیت کسقدر عجیب و غریب ہے۔ امام رازی پہلے وہلہ میں ٹھیک بات پا لیتے ہیں کہ یہاں آنحضرت صلعم پر عتاب کا کوئی موقع نہیں ہے لیکن پھر ان کو تفسیر کی وہ تمام روایتیں یاد پڑجاتی ہیں جن میں آنحضرت کو مورد عتاب ٹھہرایا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی بات بول اٹھتے ہیں جس کو سنکر آدمی کا کلیجہ کانپ اٹھے، انھوں نے اس بات کا تو خیال رکھا کہ اللہ تعالیٰ کو بے محل عتاب کے الزام سے بچالیں لیکن اس بات کو بالکل بھول گئے کہ ان کے جواب سے آنحضرت صلعم کے خلق عظیم کا دامن ایک نہایت سنگین الزام سے آلودہ ہو رہا ہے۔

لیکن یہ ساری مشکلات تفسیری روایات کی پیدا کردہ ہیں۔ جن لوگوں کی نظر قرآن مجید کے سیاق و سباق اور آنحضرت صلعم کے حالات زندگی پر ہے ان کے نزدیک اس تاویل اور ان تمام ضعیف روایات کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔

ان آیات کا ربط آگے سے

ان آیات کے اندر آنحضرت صلعم کو آپ کے بلند منصب کی طرف توجہ دلائی گئی تھی کہ آپ مغرورین اور سرکشوں کے ساتھ الحاح و اصرار کی ایسی شکل اختیار نہ کریں جو آپ کے رتبہ سے فروتر ہو۔ صرف مومنین کے ساتھ مشغول ہوں جو آپ کی توجہ کے اصلی مستحق ہیں۔ یہ مضمون مقتضی ہوا کہ یہاں مختصراً اس چیز کی

رفعت شان بھی بیان کردی جائے۔ جو آپ پر نازل کی گئی ہے۔ تاکہ یہ اچھی طرح واضح ہو جائے کہ جو لوگ ایسی گرانمایہ نعمت سے منہ پھیر رہے ہیں وہ اعراض ہی کے مستحق ہیں۔ فرمایا:-

كَلَّآ إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ (۱۱) فَمَن شَآءَ ذَكَرَهُۥ (۱۲) فِى صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍۭ (۱۴) بِأَيْدِى سَفَرَةٍ (۱۵) كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ (۱۶) قُتِلَ ٱلْإِنسَٰنُ مَآ أَكْفَرَهُۥ (۱۷) مِنْ أَىِّ شَىْءٍ خَلَقَهُۥ (۱۸) مِن نُّطْفَةٍ خَلَقَهُۥ فَقَدَّرَهُۥ (۱۹) ثُمَّ ٱلسَّبِيلَ يَسَّرَهُۥ (۲۰) ثُمَّ أَمَاتَهُۥ فَأَقْبَرَهُۥ (۲۱) ثُمَّ إِذَا شَآءَ أَنشَرَهُۥ (۲۲)

کچھ نہیں: یہ ایک یاد دہانی ہے (۱۱) سو جس کا جی چاہے اس کو یاد کرے (۱۲) قابل ادب، بلند اور پاک اوراق میں (۱۳) (۱۴) ذی رتبہ، نیک منشیوں کے ہاتھ میں (۱۵-۱۶) برا ہو آدمی کا یہ کتنا ناشکرا ہے (۱۷) اسے کس چیز سے بنایا (۱۸) ذرا سے پانی سے اسے بنایا تو اسمیں اندازہ رکھا (۱۹) پھر اسکی راہ اسے آسان کردی (۲۰) پھر اسے مردہ کیا پھر اسے قبر میں رکھوایا (۲۱) پھر جب چاہیگا اسے اٹھائیگا (۲۲)

الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل

[كَلَّآ] تبلیغ و دعوت میں آنحضرت صلعم نے جو غیر معتدل حالت اختیار کرلی تھی، اور جس پر آپکو اوپر کی آیتیں تنبیہ فرمائی گئی، کلا اس کو مزید موکد کر رہا ہے۔ یعنی بے نیازی کی تعلیم کو یہ لفظ اور زیادہ زور قوت کے ساتھ نمایاں کر رہا ہے۔ اس کا پورا مضمون گویا یہ ہوگا کہ تمہیں ہرگز زیبا نہیں ہے کہ تم ان کے ساتھ اس درجہ چمٹو۔ بعد کے ٹکڑے سے اس کی پوری توضیح ہو جاتی ہے۔

[إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ] اوپر لفظ ذکری گذر چکا ہے۔ ضمیر اسی کی طرف لوٹتی ہے۔ اس سے مراد قرآن اور اس کی آیات ہیں۔ پہلے ذکری کا لفظ تھا، بعد میں تذکرہ کا لفظ آیا ان دونوں کی رعایت معنی

ہوئی کہ ضمیر مؤنث کی لائی جائے۔ یہ جملہ دلیل کے موقع میں ہے۔ لفظ کلا میں تعلیم استغنا کا جو مفہوم مضمر تھا، اس ٹکڑے نے اس کو کھول دیا۔

[فَمَنْ شَاءَ ذَكَرَهُ] یعنی جو یاددہانی تم ان کو سنا رہے ہو جس کا جی چاہے اس کو قبول کرے۔ یہاں چونکہ متبادر مفہوم کا خیال رکھا اسلئے ضمیر مذکر کی لائے۔ کیونکہ بادل وہلہ ذہن قرآن کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ یہ جملہ "انہا تذکرہ" کی تشریح کر رہا ہے۔ یعنی قرآن محض ایک یاددہانی اور پیام ہے جس کا جی چاہے اس کو قبول کرے، جس کا جی چاہے انکار کردے۔ اکراہ یا اصرار والحاح کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں باربار بیان ہوا ہے۔ اس جملہ میں نہایت ایجاز ہے۔ بات کا صرف ایک حصہ مذکور ہوا ہے۔ مقابل کا دوسرا حصہ حذف کردیا گیا ہے کیونکہ مذکورہ حصہ خود محذوف کو واضح کر رہا ہے۔ اگر اس محذوف کو کھول دیا جائے تو پوری بات یوں ہوئی، سو جس کا جی چاہے یاد کرے اور جس کا جی چاہے نہ یاد کرے، بعض مواقع پر اسی مضمون کی تشریح ہوگئی ہے فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ۔ پس جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے انکار کردے۔

[صحف] جمع ہے صحیفہ کی۔ صحیفہ کے معنی ہیں لکھا ہوا ورق۔ صحیفہ المتلمس، صحیفہ الجور وغیرہ نام اسی معنی کے اعتبار سے پڑے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ لفظ صفیحہ سے مقلوب ہے۔ صفیحہ چوڑی چکلی چیز کو کہتے ہیں۔ صفیحۃ الحجر، صفیحۃ السلف، صفیحۃ العنق نہایت مشہور استعمالات ہیں۔ لفظ اپنی جمع کی صورت میں بعض اوقات کتاب کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ مثلاً رَسُولٌ مِّنَ اللَّهِ يَتْلُو صُحُفًا مُّطَهَّرَةً۔ "فی صحف" دراصل ھو فی صحف ہے۔ اوپر جس شے کا ذکر ہوا تھا اب اسکے اوصاف بیان ہورہے ہیں۔ اوصاف مابعد کے بیان میں مسند الیہ کا حذف ایک معروف اسلوب ہے۔ قرآن مجید میں اس کے شواہد بہت ہیں۔ کسی مقام پر ہم اس مسئلہ کو واضح کرچکے ہیں، اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اوپر ہم نے جو تاویل بیان کی ہے۔ قرآن کی ان صفتوں پر غور کرو۔ ان کے اندر بھی بعینہ وہی حقیقت بول رہی ہے۔ یعنی یہ قرآن جو اپنے رتبہ اور درجہ کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے، اس کو اس اصرار و الحاح کے ساتھ پیش کرنا ہرگز اس کے شایان شان نہیں ہے۔ پس آنحضرت صلعم کو جو استغنا کی تعلیم دی گئی تھی، قرآن کی ان صفات نے اس کی دلیل بیان کر دی۔

[مَرْفُوْعَةٍ] اس لفظ میں بلندی اور درجہ دونوں کا مضمون پنہاں ہے۔ دوسرے مقام میں اس کی تشریح ہو گئی ہے۔ مثلاً وَاِنَّهٗ فِیْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ۔ دوسری جگہ فرمایا وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ اور یہ دونوں مضمون درحقیقت "مکرمہ" ہی کی تشریح ہیں۔

[مُطَهَّرَةٍ] یہ صفت بھی درحقیقت صفت تکریم ہی کے ایک پہلو کو واضح کر رہی ہے یعنی قرآن مجید شیاطین اور ارواح خبیثہ کے دسترس سے بالکل محفوظ ہے۔ اسی مضمون کو دوسری جگہ بیان فرمایا ہے۔ فِیْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ۔ ایک اور مقام میں ہے بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ۔ اور جہاں جہاں قرآن مجید کو "کتاب عزیز" کہا ہے اس میں بھی عموماً اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

[سفرة] سافر کی جمع ہے، بمعنی قاری و کاتب۔ سفر کے معنی قرأت و کتابت کے ہیں۔ یہ لفظ عبرانی زبان میں باقی ہے۔ اس کے اصل معنی زخم لگانے کے ہیں۔ اسی سے کتابت کا مفہوم پیدا ہو گیا کیونکہ ابتدا میں جب کوئی چیز لکھنا چاہتے تو آہنی قلم سے اس کو کسی چیز پر کھودتے۔ پھر آہستہ آہستہ یہ لفظ قرأت و بیان کے معنوں کے لئے وسیع ہو گیا۔ عبرانی میں ספר (سفر) قرأت و کتابت اور زخم لگانے کے معنی میں موجود ہے اور ספר

(سافر) کاتب، فقیہ، امام اور قائد کے معنوں میں آتا ہے۔ اس لحاظ سے حضرت قتادہ کا یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کہ سفرہ سے مراد قرا ہیں نیز حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ سفرہ نبطی میں قرا کو کہتے ہیں۔ زخم لگانے کے معنی میں ہماری عربی زبان میں بھی مستعمل ہے۔ رؤبہ کا مصرع ہے۔

تسفیر موسی الصلیع الجلام

اسی طرح کتب کا مادہ عربی زبان میں اپنے اصل معنی میں باقی رہ گیا ہے۔

[کرام] یعنی اس امانت کے لئے پوری طرح قابل اعتماد ہیں۔ ان کی شرافت کی وجہ سے ان پر کسی طرح کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

[بررۃ] بار کی جمع ہے۔ بار اس شخص کو کہتے ہیں جو فرمانبردار اور اپنی ذمہ داری کو ٹھیک ٹھیک پورا کرنے والا ہو۔ اس صفت نے ان کی امانت داری کے وصف کو اور زیادہ نمایاں کر دیا۔ اس مضمون کی طرف قرآن مجید کی مختلف آیات اشارہ کر رہی ہیں مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْاَمِيْنُ، دوسرے مقام پر ہے اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ، ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ۔

ان آیتوں کا مفاد قرآن مجید کی عظمت وشان کو بیان کرنا ہے کہ اس قدر بلند رتبہ اور اشرف چیز اس لئے نہیں ہے کہ اس الحاح و اصرار کے ساتھ ان لوگوں پر پیش کی جائے اور یہ لوگ اس سے اعراض کریں۔

علاوہ ازیں ان آیات سے قرآن مجید کی بعض نہایت اہم صفتیں روشنی میں آگئی ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے پاس لکھا ہوا ہے۔ پڑھا جاتا ہے، ہر طرح کے اختلاط و امتزاج سے بالکل پاک ہے۔

ہاں ایک خاص بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ یہاں رفع، تطہیر اور صحیفہ وغیرہ کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ تمام تر ایسے حقائق کی تعبیر کے لئے اختیار کئے گئے ہیں جن کا تعلق

ملأ اعلیٰ سے ہے۔ ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ صرف مفاد اور نتیجہ ہے باقی رہی ان کی اصلی تاویل تصویر تو یہ چیز اس مقام کے احوال و معاملات کے شایان شان ہوگی۔

[قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ] الانسان کے لفظ سے عموماً انسانوں کا غالب حصہ مراد ہوتا ہے یعنی کفار۔ پس یا تو لام عہد کا ہوتا ہے یا یہ ہوتا ہے کہ بلحاظ اکثریت پوری نوع پر ایک حکم لگا دیتے ہیں۔ فرمایا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ۔ اس کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔ (قتل) اصل حقیقت سے ہٹکر محض اظہار غضب کے لئے استعمال ہوا ہے (مَآ اكفره) میں اس غضب کا سبب بیان ہوا ہے اور انسان کی اس روش پر اظہار نفرت ہے۔

[مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ] یہ استفہام تحقیر کے لئے ہے۔ اس کے بعد انسان کی حالت بیان ہوئی ہے، یہ ٹکڑا اس کی تمہید ہے۔

[نطفة] تھوڑا سا نچڑا ہوا پانی۔ ابو صعترہ بولانی کا شعر ہے۔

فما نطفة من حب مزن تقاذفت به جنبتا الجودی واللیل دامس

قرآن مجید میں ہے۔ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ۔ اس نطفہ کی حقیقت پر غور کرو اور دیکھو بعث کے بارہ میں جو استبعاد لوگوں کو نظر آتا تھا اس کو [illegible] دور کر دیا ہے۔ کیونکہ اس سے صاف واضح ہے کہ انسان کی ابتدائی خلقت ہی اس طور پر ہے کہ اس کا مادہ مختلف گوشوں سے نچوڑ نچوڑ کر جمع کیا گیا ہے۔ پھر جب ایک بات زندگی کے ایک مرحلہ میں ممکن ہوئی تو وہی بات دوسرے مرحلہ میں کیوں ناممکن ہو جائے گی۔ اسی حقیقت کو سمجھانے کے لئے قرآن مجید نے ایک جگہ نہایت لطیف اشارہ کیا ہے وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ اور تم اپنی پیدائش کا حال جان چکے ہو تو اس سے کیوں نہیں سبق حاصل کرتے۔

[قَدَّرَهٗ] یعنی اسکے اعضا اور قوی کے لئے اپنی مرضی کے مطابق ایک اندازہ ٹھہرایا۔ اس

مقصود انسان کے عجز و درماندگی اور خدا کے کمال تصرف و اقتدار کا اظہار ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ اس میں اپنے کمال تصرف و احاطہ کے علاوہ اپنے مخصوص فضل و احسان کی طرف بھی اشارہ فرمایا کہ اس نے اپنے حسن تقدیر سے انسان کو اپنی بہترین مخلوق بنایا۔ ایک آیت نے اس مضمون کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ۔ یہاں اشارات پر اکتفا کرتے ہیں، تفسیر سورۂ تین میں اس کی تفصیلات ملیں گی۔

[السبیل] اس میں الف لام عہد کے لئے ہے۔ یعنی وہ راستہ جس میں انسان اپنے اعضاء و قویٰ کی مدد و رہنمائی سے گامزن ہوتا ہے۔ پس یہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے کہ اس نے اعضاء و قویٰ عنایت کئے اور پھر ان کے استعمال کرنے اور برتنے کا ڈھنگ بتایا۔ اور اس کیلئے تمام اسباب و وسائل فراہم کر دیئے۔ چنانچہ فرمایا ہے۔ اَلَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى، وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى، جس نے خلق کیا پھر تسویہ کیا اور جس نے اندازہ ٹھہرایا پھر اس کی طرف رہنمائی کی۔ اس سے زیادہ واضح لفظوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی نقل فرمایا ہے۔ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى۔ ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت بخشی پھر رہنمائی کی۔ اور یہ بات قرآنِ مجید نیز اصول فطرت سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے سامنے خیر و شر دونوں کی راہیں کھول دی ہیں اور دونوں کے سمجھنے اور پرکھنے کے لئے عقل و بصیرت بخش دی ہے، پس انسان جس کو چاہے، اختیار کرلے۔ وہ ان میں سے کسی راہ پر مجبور نہیں کیا گیا ہے۔ فرمایا۔

فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا	پس ہم نے اس کو سمیع و بصیر بنایا۔
اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا	بیشک ہم نے اس کو ہدایت ہی راستہ کی (موقع مقتضی ہے
شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا	کہ یہاں راستے سے مراد خیر کا راستہ لیا جائے) چاہے وہ

دوسری جگہ فرمایا۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا۝

اور دل اور جیسا اس کو بنایا، پس اسکو سمجھ دی بدی اور نیکی کی کامیاب ہوا جس نے اسے صاف کیا اور ناکام ہوا جس نے اسے

قرآن مجید، اور عقل ونقل کی تمام شہادتیں اس بات پر متفق ہیں کہ تیسیر ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے اور اس کا قانون یہ ہے کہ آدمی اپنی پسند سے اپنے لئے جو راہ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے اس راہ کو آسان کرتا ہے چنانچہ فرمایا ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى۝ وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى۝

سو جس نے سخاوت کی اور ڈر چلا اور اچھی بات کو سچ مانا، اس پر ہم سہج کر دینگے آرام دینے والی اور جس نے بخالت کی اور بے پروائی کی اور اچھی بات کو جھٹلایا اس پر

پس اس مقام پر تاویل یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اسکو برائی اور بھلائی کی تمیز دی اور اس کو اختیار بخشا کہ وہ ان دونوں راہوں میں سے جس راہ کو چاہے اپنے لئے پسند کرے۔ ان میں سے کسی راہ پر اس کو مجبور نہیں کیا۔ اور اس کے تمام اعضا و قویٰ اور اسباب کو اس کے ارادہ کے ماتحت کیا، ان میں سے کسی چیز کو اس کے ارادہ پر حاکم نہیں بنایا۔ اور یہ وہ سب سے بڑی نعمت و سرفرازی ہے جو انسان کو اپنے پروردگار کی طرف سے حاصل ہوئی۔ اس کی پوری تفصیل اپنے محل میں آئے گی۔

[فَاَقْبَرَهٗ] قبرہ کے معنی ہیں اس کو دفن کر دیا۔ اور اقبرہ کے معنی ہیں اس کے لئے قبر بنائی۔

[اَنْشَرَهٗ] کھول دیا۔ پھیلا دیا۔ چھینٹ دیا۔ باب افعال مبالغہ کے مفہوم کے لئے بھی آتا ہے۔ یہاں مطلب ہوگا کہ دفن ہو جانے اور سڑ گل جانے کے بعد اس کو سیدھا اٹھا کھڑا کرے گا۔ (باقی)

تدبر قرآن

(۴)

امین احسن اصلاحی

تدبر قرآن کے داخلی اور خارجی وسائل

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا تعلق ارادہ اور نیت کی تصحیح اور غایت و مقصد کی پاکی اور طہارت سے تھا۔ جس طرح نماز کے لئے وضو اور نیت کا اخلاص و تزکیہ شرط ہے، اسی طرح قرآن مجید کے فہم و تدبر کے لئے شرط ہے کہ طالب دل کی سچی پاکی اور ارادہ کی بے لوث صداقت کے ساتھ اس کی طرف بڑھے۔ بغیر اس کے قرآن کا دروازہ نہیں کھل سکتا۔ یہ شرطیں خود قرآن مجید نے بیان کی ہیں اور قرنوں کا تجربہ اس حقیقت کی تصدیق کر رہا ہے اور یہ اس درجہ واضح امر ہے کہ سلف میں سے جن لوگوں نے بھی مفسر کی ضروری خصوصیات کی تفصیل کرنی چاہی انھوں نے سب سے پہلے اسی مقدم شے کا ذکر کیا۔

اس کے بعد قرآن مجید کے فہم و تدبر کے داخلی اور خارجی اسباب و وسائل کا سوال سامنے آتا ہے۔ یعنی ایک تو یہ بات کہ قرآن مجید کو کس طرح پڑھنا چاہئے، کتنی مقدار میں پڑھنا چاہئے، کیا کیا ترتیبیں پیش نظر رکھنی چاہئیں، نظم کو کس طرح پکڑنا چاہئے، معانی کو کس طرح سلجھانا چاہئے، مشکلات میں کس طرح جمنا چاہئے، پھیلے ہوئے خیالات کو کس طرح سمیٹنا چاہئے، سمٹے ہوئے خیالات کو کس طرح پھیلانا چاہئے، یعنی بالاجمال یہ بات کہ قرآن کی مشکلات میں خود قرآن مجید کی رہنمائی سے کس طرح فائدہ اٹھانا چاہئے اور دوسری یہ بات کہ قرآن مجید سے باہر کیا کیا چیزیں ہیں جو قرآن کے فہم و تدبر میں ہماری مدد کر سکتی ہیں اور ان سے کن شکلوں میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

ان میں سے پہلے سوال کا تعلق زیادہ تر نظم قرآن کے ابواب و مباحث سے ہے، اس لئے ہم اس پر بہ ترتیب ایک دوسرے سلسلہ مضامین میں، جو عرصہ سے پیش نظر ہے، غور کریں گے۔ یہاں صرف پہلے سوال کی ایک اہم اصل اور دوسرے سوال کے بعض ضروری امور کی طرف بالاجمال اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

قرآن مجید کے فہم و تدبر کے لئے اصلی چیز خود قرآن مجید ہی ہے۔ اس لئے طالب کو چاہئے کہ وہ تمام مشکلات میں پہلے قرآن مجید ہی کی رہنمائی ڈھونڈھے۔ سلف کا مسلک مذہب یہ ہے کہ القرآن یفسر بعضہ بعضاً اور قرآن نے خود اپنی صفت "کتابا متشابہا" بیان کی ہے، نیز بعض مواقع پر اس امر کی بھی تشریح ہے کہ جس طرح وحی و تنزیل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اسی طرح اس کے بیان و تفصیل کی ذمہ داری بھی اسی پر ہے۔ ہر چند یہ بات اصول کی حیثیت سے ہر دور میں ارباب تاویل کے پیش نظر رہی، لیکن یہ بات کہ معاملہ کیونکر ہے، کبھی تفصیل و وضاحت کے ساتھ لوگوں کے سامنے نہیں آئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عموماً ارباب تفسیر کو یہ راہ نہایت دشوار نظر آئی اور وہ بعض ایسی وادیوں میں نکل گئے جو فہم قرآن سے نہایت دور کرنیوالی تھیں۔ حالانکہ فہم قرآن کی کلید خود قرآن ہی ہے۔ وہ اپنے تمام اجمالات کی خود تشریح کرتا ہے، اپنے مفہوم و معنی کی تعیین، اپنے مقاصد و مطالب کی تفسیر اور اپنے نکات و دقائق کی تشریح کیلئے کسی چیز کا محتاج نہیں ہے۔ بلکہ بلاغت قرآن کا یہ ایک عجیب اعجاز ہے اور یقیناً اس آسمان کے نیچے صرف اسی کتاب عزیز کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اپنے اکثر مشکل الفاظ اور دقیق اسالیب کے حل کے لئے اپنے اندر اشباہ و نظائر کا ایک قیمتی ذخیرہ بھی رکھتی ہے۔ افسوس ہے کہ یہاں مثالوں کی تفصیل میں پڑنے کی گنجائش نہیں ورنہ ہم دکھاتے کہ کس طرح قرآن مجید عام عام بول چال کے اندر سے ایک معمولی لفظ اٹھا لیتا ہے اور اس کو اس کے معروف و متداول استعمال سے کہیں زیادہ ارفع و بلند معنی میں استعمال کرتا ہے اور پھر اپنے طریق استعمال کے تنوع سے اس کے لئے ایک ایسا مخصوص ماحول پیدا کر دیتا ہے کہ لسان اور صحاح جوہری کی رہنمائی کے بغیر قرآن کا ایک طالب، جس نے قرآن کی ممارست کی ہے اس لفظ کے پورے ہالہ و ماعلیہ کو اس طرح سمجھ لیتا ہے کہ

کوئی چیز بھی اس کے یقین کو جھٹلا نہیں سکتی۔ مفردات کے علاوہ اسالیب کلام اور نحوی تالیف وغیرہ کے باب میں بھی قرآن مجید کا یہی حال ہے۔ ارباب نحو قرآن مجید کی جن ترکیبوں میں نہایت الجھے ہیں اور کسی طرح ان کو نہیں سلجھا سکے ہیں، خود قرآن مجید میں ان کی مثالیں ڈھونڈھو تو ایک سے زیادہ مل جائیں گی اور پیش و عقب کے ایسے دلائل و قرائن کے ساتھ کہ ان کے بارہ میں تمھارے اطمینان کو کوئی چیز مجروح نہیں کر سکتی۔ باقی رہیں قرآن مجید کی تعلیمات، اس کے تاریخی اشارات، اس کی مخفی تلمیحات تو یہ تو ایسی چیزیں ہیں جن کے باب میں ہر گروہ نے القرآن یفسر بعضہ بعضا کے اصول کو تسلیم کیا ہے۔ اس باب میں لوگوں سے جو کچھ کوتاہی ہوئی وہ صرف اسقدر ہے کہ پوری تدقیق سے کام نہیں لیا گیا۔ جتنا اگلوں نے کیا لوگ اسی پر قانع ہو گئے، حالانکہ اس میں بہت وسعت ہے اور قرآن مجید کے شواہد اسقدر متنوع اور مختلف شکلوں میں اور اسقدر کثرت کے ساتھ موجود ہیں کہ ہر بات کو واضح کر دینے کے لئے بالکل کافی ہیں۔ پس جو لوگ قرآن مجید پر تدبر کرنا چاہیں ان کو چاہئے کہ وہ قرآن مجید ہی کو مضبوط پکڑیں اور اس کی ہر مشکل کو خود اسی کی مدد سے حل کرنے کی کوشش کریں لیکن اس کا ایک مخصوص ضابطہ ہے جس پر ہم انشاء اللہ کسی صحبت میں مفصل بحث کریں گے۔ ہمارے نزدیک یہ طریقہ صحیح نہیں ہے کہ قرآن مجید کا مطالعہ تفسیروں کی مدد سے شروع کیا جائے۔ اس راہ میں طرح طرح کے خطرے ہیں۔ ہم تفسیروں کی حالت پر ان صفحات میں بحث کر چکے ہیں۔ اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے پاس جو تفسیریں ہیں وہ دو ہی قسم کی ہیں۔ یا تو وہ کسی خاص اسکول کی ترجمانی کر رہی ہیں، یا روایات اور اقوال سلف کے تمام رطب و یابس کا مجموعہ ہیں اور ایک حقیقی طالب کی راہ میں یہ دونوں چیزیں روک ہو سکتی ہیں۔ طالب جب ان کے چکر میں پھنس جاتا ہے، اس کی جستجو اور تحقیق کی رو طبعی نہیں رہ جاتی، مصنوعی اور غیر طبعی ہو جاتی ہے۔ وہ اس راہ پر پڑ جانے کے بعد قرآن کے لفظوں کی رہنمائی سے محروم، اور اس کا مذاق آہستہ آہستہ دوسروں کے خیالات و افکار سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ پس صحیح راہ یہی ہے کہ آدمی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائے، صرف قرآن کو اپنی تمام توجہ کا مرکز بنائے، اس کی ایک ایک آیت بلکہ ایک ایک لفظ پر تدبر کرے۔ ٹھیک مفہوم

متعین کرے، طبیعت میں جو سوال پیدا ہو، اس پر بار بار غور کرے۔ جو بات سمجھ میں آئے اس کے امثال و شواہد تلاش کرے، سیاق و سباق سے اس کی مطابقت معلوم کرے، نظم کے اعتبار سے اس کا موقع و محل دیکھے، خود کلام کے پہلو سے اس کی مناسبت کو جانچے، پھر اس پر خود اپنی طرف سے شکوک وارد کرے اور جب دیکھ لے کہ اس نے جو بات سمجھی ہے بالکل پکی ہے، اس میں کسی پہلو سے کوئی خامی نہیں ہے، تب تفسیروں میں اس کو دیکھے اور ہمیشہ روایات صحیحہ پر نگاہ رکھے ضعیف اور کمزور روایات، جن سے کتب تفسیر بھری ہیں کبھی ہاتھ نہ لگائے۔ انشاء اللہ روایات صحیحہ سے اس کی تائید ہوگی اور اپنے دل میں ایک ایسی خوشی کا جوش محسوس کرے گا جس میں اطمینان، بلندی، اعتماد اور عشق و محبت قرآن کی نہیں معلوم کتنی کیفیتیں ممزوج ہوں گی۔

لیکن فرض کرو، یہ سب جتن کرنیکے بعد تم کسی آیت کے باب میں ایک نتیجہ تک پہنچے اور جب کتب تفسیر کی مراجعت کی تو معلوم ہوا کہ احادیث صحیحہ اور اقوال سلف تمھارے قرار دادہ مطلب کے خلاف ہیں اور کوئی قابل اعتنا تائید بھی تمھارے ساتھ نہیں ہے تو اس وقت کیا کرو گے؟ روایات اور اقوال سلف کو چھوڑ کر اپنی بات پر جم جاؤ گے؟ نہیں۔ طالب کی راہ یہ نہیں ہے۔ اب تم ان احادیث اور اقوال کی روشنی میں اپنی تاویل پر دوبارہ غور کرو گے، اور اگر دقیقہ سنجی سے کام لو گے تو تم پر (اگر تم غلطی پر ہو گے) تمھاری غلطی خود واضح ہو جائے گی۔ لیکن فرض کرو، تم نے یہ مرحلہ بھی طے کر لیا مگر تم کو اپنی ہی تاویل واضح معلوم ہوتی ہے۔ اب کیا کرو گے؟ اب خود حدیث پر غور کرو گے، اس کو ہر پہلو سے پرکھو گے، ہر کسوٹی پر جانچو گے۔ انشاء اللہ یہ چیز تمھارے لئے مفید ہوگی۔ یا تمھاری تاویل کا ضعف واضح ہو جائے گا، یا حدیث کی اصل حقیقت واضح ہو جائیگی، لیکن طالب کے لئے یہ مرحلے نہایت سخت ہیں۔ ان میں صبر و ثبات کی ضرورت ہوتی ہے۔ عجلت اور تیز گامی اس منزل میں معصیت ہے۔ ان مواقع پر مدت تک توقف کرنا چاہئے، تحقیق و کاوش جاری رکھنی چاہئے۔ ارباب علم سے مشورہ کرنا چاہئے، اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہئے، اور جب قلب پوری طرح سے ایک بات کیلئے کھل جائے، کسی طرح کی کوئی خلش باقی نہ رہ جائے تو اس بات کو اختیار کر لینا چاہئے اور پھر اس امر کی اصلاً

نہ کرنی چاہئے کہ کوئی چیز اس کے خلاف ہے۔

ہم نے روایات صحیحہ اور اقوال سلف کی افادی حیثیت پر اپنے مضمون تیسیر قرآن میں ایک فصل لکھی ہے، یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کو پڑھ لو۔ ہمارا خیال ہے کہ جن لوگوں کے اندر تحقیق و کاوش کا ذوق ہے، اور جہل و غباوت نے ان کے قلوب مردہ نہیں کر دیئے ہیں، وہ اعتراف کریں گے کہ ایک طالب قرآن کو اس کی طلب و جستجو کی راہ میں جو رہنمائی ان سے ملتی ہے، وہ اور کسی چیز سے نہیں ملتی، پس جو لوگ ان سے مستغنی ہو جائیں گے وہ قرآن کے طالب نہیں ہیں، اپنی خواہشوں کے پرستار ہیں۔

اس طریقہ فکر و نظر کا ایک خاص فائدہ یہ ہے کہ اس سے آدمی کو جو کچھ ملتا ہے، یہ اس کی تحقیق و کاوش کا ثمرہ ہوتا ہے اور ہمارے دل کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ وہ اپنی کمائی کو بہت عزیز رکھتا ہے، اس کی محبت اس کے ریشہ ریشہ میں پیوست ہو جاتی ہے اور اس کی حفاظت کی راہ میں وہ کسی چیز سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ گویا اصلی ایمانی کیفیت جو قرآن کی اصلی منزل مقصود ہے اسی طریقہ فکر و نظر سے ملتی ہے۔ پھر اس سے طالب کے زاویہ نگاہ میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ ٹھوکریں کھا کر اور سختیاں جھیل کر فکر و تدبر کے میدان کا آزمودہ کار سپاہی بنجاتا ہے اور تحقیق و کاوش کے مورچوں پر بزدل اور پست ہمت نہیں ہوتا۔ وہ گھسنے کی تمام راہوں اور نکلنے کے تمام منافذ کا ماہر ہوتا ہے۔ اس کی ایک راہ بند کر دو، دوسری راہ کھول لے گا، ایک دروازہ نہیں کھلے گا، دوسرے دروازہ پر دستک دے گا۔ اس طرح درجہ بدرجہ وہ اپنی منزلیں طے کرتا ہوا اس مقام تک پہنچ جائے گا جو حکمت اور معارف نبوت کی اصلی جلوہ گاہ ہے۔ یہاں پہنچ کر اس کی معلومات تمہاری معلومات سے بالکل مختلف ہونگی، تم جس چیز کو معبود بنا کر پوجتے ہو اس کو وہ بال مگس کے برابر بھی وقعت نہ دیگا اور جسکو پتھر سمجھکر ٹھکرا دوگے اسکو وہ حرز جاں بنا کر گرہ کرے گا۔ یہ اس لئے کہ تمھارے پاس کوئی تجربہ نہیں ہے۔ لیکن اس کے پاس جتنا تجربات کی رہنمائی ہے، وہ اس سمندر کے عجائب سے واقف ہے۔ تم اس منزل کے رسم و راہ سے واقف نہیں ہو تو خاموش رہو بلکہ اپنی محرومیوں پر افسوس کرو، مگر تم کو ہنسنے سے بھی کوئی روک نہیں سکتا کیونکہ تم

یا تو اقوال کے غلام ہو یا خواہشوں کے، اور تحقیق کی راہ ان دونوں سے الگ ہے۔

قرآن مجید کے تدبر میں عہد نزول قرآن اور قدیم عرب اور ان سے متعلق اقوام کی تاریخ بھی ایک ضروری عنصر ہے۔ قرآن کی بے شمار آیتیں عرب کی قدیم تاریخ اور اس سے متعلق اقوام و جماعات کے احوال و ایام کی طرف اشارے کرتی ہیں اور بالعموم یہ اشارات اس درجہ مجمل و مبہم ہیں کہ ان کا صحیح تصور ذہن میں قائم ہونا مشکل ہوتا ہے۔ بلاشبہ قرآن مجید کی تعلیمات کے سمجھ لینے میں یہ ابہام و اجمال مانع نہیں ہے لیکن ان اشارات کے صحیح تصور سے کلام کی تاثیر میں ایسا اہم اضافہ ہو جاتا ہے کہ اس سے اغماض نہیں کیا جا سکتا بلکہ ہو سکتا ہے کہ قرآن کی جن سورتوں کو سنکر عہد نزول قرآن میں ایک عرب بیخود ہو جاتا ہو تمھارے لئے بالکل بے اثر ہو جائے پھر قرآن مجید کی تاریخ پر پوری ۱۳ صدیاں گذر چکی ہیں اور ہم کو موجودہ دنیا کے سامنے اس کو پیش کرنا ہے۔ عہد نزول میں جو واقعات و احوال ہر شخص کے جانے بوجھے ہوئے تھے، موجودہ دنیا کے لئے بالکل نامعلوم ہیں۔ اور علم و تحقیق کی ترقیوں نے کسی امر کے رد و قبول کا معیار اسقدر بلند کر دیا ہے کہ جب تک اس عہد کی پوری دنیا اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ سامنے نہ آجائے، لوگوں کے لئے کسی بات کو باور کرنا مشکل ہے۔ علاوہ ازیں اس عہد کی تاریخ کی بے شمار چیزیں ہم کو اس لئے بھی معلوم ہونی چاہئیں کہ بغیر ان کو سمجھے ہوئے قرآن مجید کی تعلیمات کا اصلی وزن نہیں معلوم ہو سکتا مثلاً اس عہد کی تمدنی حالت، سیاسی رجحانات، مذہبی عقائد و تصورات، اخلاقی معیار، مختلف قوموں کے باہمی تعلقات، دستور و مراسم، اصنام و انصاب اور ان کے سیاسی و تمدنی اثرات وغیرہ وغیرہ۔ قرآن مجید پر غور کرنے والوں کو، اگر فکر و نظر صحیح نہج پر ہے، ان امور کے متعلق طرح طرح کی کاوشیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور نہایت بدقسمتی کی بات ہے کہ ایک تفسیر بھی ایسی نہیں ہے جو ان چیزوں کے متعلق کوئی رہنمائی کرے۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ عرب کی تاریخ سے متعلق ہمارے پاس جو معلومات ہیں وہ نہایت مسخ شدہ ہیں اور ان سے بجائے اس کے کہ کوئی فائدہ پہنچے، نہایت شدید نقصان پہنچتا ہے۔ پس اس معاملہ میں بھی صحیح مسلک یہی ہے کہ

اصلی معتمد قرآن مجید ہی کو بنایا جائے اور تاریخوں کی پیش کردہ معلومات پر قرآن کی روشنی میں غور کر کے صرف اتنے ہی حصہ کو اختیار کیا جائے جتنا قرآن مجید سے موافق پڑتا ہے۔ اس معاملہ میں استاذ امام کے طریق فکر و نظر کا اندازہ کرنے کے لئے سورہ فیل کی تفسیر پڑھنی چاہئے۔ ان کا اصلی اعتماد قرآن مجید کے اشارات اور کلام عرب پر ہوتا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ اس باب میں دو چیزوں کے سوا کسی تیسری چیز سے مشکل ہی سے کوئی مدد ملتی ہے۔

قرآن مجید کی زبان اور اس کے اسالیب کی مشکلات حل کرنے اور اس کے محاسن بے نقاب کرنے میں تین طرح کی چیزیں مدد دے سکتی ہیں۔

(۱) کتب لغت

(۲) کتب نحو

(۳) کتب بلاغت

کتب لغت میں نسبتاً لسان سب سے زیادہ مدد دے سکتا ہے۔ یہ سب سے زیادہ جامع ہے۔ اہل لغت کا تمام قال و قیل اس میں یکجا مل جاتا ہے۔ لیکن قرآن مجید کے الفاظ کے بارہ میں عموماً ارباب تاویل کے اقوال بھی نقل کر دیتا ہے اس سے بچنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ مراجعت کا اصلی فائدہ فوت ہو جاتا ہے۔

بعض لوگ مفردات امام راغب کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ بے شبہ یہ ایک کارآمد چیز ہے اور اس اعتبار سے قابل قدر کہ خالص قرآن کا لغت ہے لیکن حل مشکلات کے اعتبار سے اس کا کوئی وزن نہیں ہے۔ صرف مبتدیوں کو اس سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس کا نہج صحیح ہے لیکن نہ تو اس میں پورا تتبع اور استقصاء ہے نہ شہادات کلام عرب اور نظیران کے فائدہ معلوم؛

اصلی چیزیں جن کی ایک طالب کو ضرورت پڑتی ہے یہ ہیں کہ ایک لفظ کے صحیح حدود و اطراف کیا ہیں، یہ خالص عربی ہے یا مولد، پھر اس کے اصلی معنی کیا ہیں اور اس کے معانی میں سے کس پر اس کا

اطلاق حقیقۃً ہے اور کن پر بطریق مجاز۔ لیکن یہ باتیں لغتوں سے مشکل ہی سے معلوم ہو سکتی ہیں۔ اس اعتبار سے کوئی لغت بھی کارآمد نہیں ہے۔ کہیں کہیں صحاح جوہری میں بعض چیزوں کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ مگر بہت کم۔

پس قابل اعتماد چیز اس باب میں بھی کلام عرب ہی ہے۔ لفظ کے اصلی حقایق اسی سے کھلتے ہیں پھر اسالیب کلام کا معاملہ تو سرتاسر اسی سے متعلق ہے۔ لغت سے ان کے باب میں کوئی رہبری نہیں ہوتی۔ لیکن کلام عرب میں بھی اصلی اور منقول دونوں ہیں۔ آدمی کو ایک عرصہ تک ممارست کے بعد، اگر ذوق اچھا ہو۔ اصلی و نقلی کے مابین امتیاز ہوتا ہے اور یہ شئے ضروری ہے۔ ورنہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بالکل شاذ معنی کو اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً بعض لوگوں نے تمنی کے معنی تلاوت کے یا نحر کے معنی سینہ پر ہاتھ باندھنے کے لے لئے۔ اسکی مثال تفسیروں میں بہت ملتی ہے۔

استاذ امام کا تمامتر اعتماد کلام عرب پر تھا۔ وہ جس لفظ یا اسلوب کے بارہ میں متردد ہوتے اس کو صرف قرآن مجید اور کلام عرب میں ڈھونڈتے۔ بعض الفاظ و اسالیب کی تلاش میں انھوں نے مدتیں صرف کر دیں۔ ان کی کتاب الاسالیب اور مفردات میں اس سلسلہ کے تمام معرکے ملیں گے۔ غثاء احوی میں لفظ غثاء کے باب میں خود فرماتے تھے کہ میں نے برسوں صرف کر دیے۔ اس لفظ کے بارہ میں ان کو تمام اہل لغت اور ارباب تفسیر سے اختلاف تھا۔ ایک مدت تک وہ اس کی تحقیق میں کلام عرب کا ذخیرہ چھانتے رہے۔ اور فرماتے تھے کہ جس روز میری تحقیق مکمل ہوئی مجھے وہ خوشی حاصل ہوئی جو بادشاہوں کو ملکوں کی تسخیر میں بھی نہیں ہوتی ہے۔

کتب نحو کا معاملہ کتب لغت سے بھی زیادہ مایوس کن ہے۔ یہ لوگ قرآن کی نحوی مشکلات کو بالعموم شواذ کے سلسلہ میں ذکر کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن عرب کے سب سے زیادہ معروف اسلوب پر اترا ہے۔ ارباب تفسیر میں سے زمخشری رحمۃ اللہ علیہ کے سوا اور لوگوں نے اس چیز کو لحاظ کی

بہت کم کوشش کی اور یہ کام تنہا ایک شخص کے بس کا نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ تفسیر کی کتابوں میں اس باب کی مشکلات حل کرنے کیلئے ہم کوئی قیمتی رہنمائی نہیں رکھتے۔ اور چونکہ اپنے اندر مزید کشف و تحقیق کی ہمت بھی نہیں پاتے اسلئے مجبور ہیں کہ ارباب نحو نے جو اصول بیان کر دیئے ہیں انہی پہ اعتماد کریں اور کسی نہ کسی طرح قرآن مجید کو انہی کے مطابق ثابت کر دکھائیں۔ حالانکہ اسکی وجہ سے تاویل کی بے شمار لاینحل مشکلات پیدا ہوگئی ہیں پس قرآن کے طلبہ کو چاہئے کہ نحوی مشکلات میں کلام عرب پر اعتماد کریں تاکہ ایک طرف صحیح تاویل کی راہ کھلے دوسری طرف دنیا پر یہ حقیقت روشن ہو جائے کہ درحقیقت قرآن ہی کا اسلوب اعلیٰ اور معروف اسلوب ہے۔ استاذ امام کے مطبوعہ رسائل میں ان کے طریق تحقیق کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ اور آئندہ ان کی دوسری تصنیفات میں بھی انکی کاوشیں ملیں گی۔ انکی رہنمائی سے اس سلسلہ میں بہت کچھ خدمت انجام دیجا سکتی ہے۔

فن بلاغت کی نارسائیوں کا حال سب سے زیادہ یاس انگیز ہے۔ ارباب بلاغت کا تمامتر ماخذ شعرا کا کلام ہے۔ اور شعر کی تنگ دامانیوں کا حال معلوم۔ اسلئے انکی تمام جولانیاں دروبست کی نزاکتوں، الفاظ کے حسن و قبح اور بدیع کی گلکاریوں تک محدود رہ گئیں۔ باقی یہ باتیں کہ حسن استدلال کے کیا کیا پہلو ہیں، ربط معنی کی کیا کیا ادائیں ہیں، امثال و قصص سے عبرت پذیری کے کیا کیا اطوار ہیں، کلام کس کس طرح چلتا ہے کس کس طرح اپنے مرکز اور عمود کی طرف مڑتا ہے، تہدید و زجر کے کیا کیا اسلوب ہیں، متکلم اپنی شدت یقین کو کس طرح ظاہر کرتا ہے۔ مترفانہ اعراض کے کیا کیا ڈھب اختیار کرتا ہے۔ ایک شفیق معلم کن کن شکلوں میں حسرت کرتا ہے۔ عتاب میں محبت کی جانوازیاں کس طرح ہوتی ہیں۔ خطاب کے عجائب تصرفات کا کیا عالم ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان مباحث سے ہمارا تمام دفتر بلاغت بالکل خالی ہے۔ یہ چیزیں خطبار کے کلام میں مل سکتی تھیں یا وحی الٰہی میں خطبار کا کلام ملا نہیں، اور وحی الٰہی کو لوگوں نے ماخذ نہیں بنایا۔ اس سلسلہ میں باقلانی رحمہ اللہ کی کوشش قابل قدر ہے لیکن وہ بھی مجبور ہوئے کہ اصول کے استنباط کے لئے شعروں ہی کو ماخذ قرار دیں، خطبار کے کلام کی طرف اول تو پوری طرح متوجہ نہیں ہوئے اور ہوئے تو محض اسقدر کہ انکے کچھ سرسری نمونے پیش کرکے گذر گئے۔ ابن تیمیہ و ابن قیم کی تصنیفات میں بعض جواہر ریزے ملتے ہیں لیکن کاوش اور تلاش کی ضرورت ہے۔ استاذ امام کی جمہرۃ البلاغہ شائع ہو تو یہ چہرہ بے نقاب ہو۔ انھوں نے اس فن کی ترتیب ہی

بدل دی ہے اور نئے اصول دریافت کئے ہیں جو بلاغت قرآن کے جانچنے کیلئے صحیح معیار قرار پاسکتے ہیں۔

قرآن کے طالب کو کتب سابقہ پر بھی نظر رکھنی ہوگی۔ بلاشبہ احکام و حقائق کے باب میں، ہم کتب سابقہ کے محتاج نہیں ہیں۔ آفتاب کی تابانی کے بعد ستاروں کی رہنمائی کی ضرورت نہیں باقی رہ جاتی۔اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے نزول قرآن کے بعد ان محرف کتابوں سے اعراض کیا۔

لیکن بعض مقاصد ضروریہ ایسے ہیں جن میں کتب سابقہ کا مطالعہ نہایت مفید ہوتا ہے۔ یہ قطعی ہے کہ قرآن مجید کتب منزلہ میں سے ایک ہے اور ہمارے پیغمبر صلعم سلسلہ انبیا کی آخری کڑی ہیں پس سابق کتابوں کے مطالعہ سے ہم کو طرح طرح کے فائدے ہونگے۔ ہم پر قرآن مجید کی حقیقی عظمت آشکارا ہوگی۔ قرآن کی تمام تلمیحات بے نقاب ہوں گی۔ اہل کتاب کے اسکات کے دلائل ہاتھ آئیں گے۔ یہ آخری چیز اس زمانہ میں نہایت اہم ہوگئی ہے۔ اہل کتاب کو قرآن کے بعض حوالوں پر طرح طرح کے اعتراضات ہیں اور ان سے عہدہ برا ہونا اسی وقت ممکن ہے جب توریت و انجیل اور ان سے متعلق اہل کتاب کے تمام لٹریچر پر آدمی کی نظر ناقدانہ ہو۔

قرآن مجید کی تلمیحات و اشارات کا معاملہ بھی نہایت دقیق ہے۔ قرآن مجید پر ابتدائی ایمان لانے والے یا تو اہل کتاب تھے جو اپنی گھر کی باتوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ یا مسلمان تھے جو اہل کتاب سے اختلاط و تعلق رکھنے کی وجہ سے ان امور سے باخبر تھے۔ اس لئے قرآن مجید نے اہل کتاب کے عقائد، ان کے مزعومات، ان کی تحریفات، اور ان کے تاریخی واقعات وغیرہ کے متعلق اسقدر اجمالی اشارات کئے ہیں کہ ان کا صحیح تصور قائم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اور آج یہ اسی وقت ممکن ہے جب اہل کتاب کے صحیفوں اور ان کے مذہبی لٹریچر پر پوری نظر ہو۔

پھر قرآن مجید نے بعض مقامات میں ان کی کتابوں کا اس طرح حوالہ دیا ہے کہ اس میں ایک حد تک حث و تحریض کی شان پیدا ہوگئی ہے۔ مثلاً فرمایا۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ

ہم نے زبور میں ذکر کے بعد لکھ دیا ہے کہ زمین کے وارث ہمارے صالح بندے ہوں گے

دوسری جگہ فرمایا

إِنَّ هَٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ

بیشک یہ بات پہلی کتابوں میں بھی لکھی ہوئی ہے ابراہیم اور موسیٰ کی کتابوں میں۔

تاریخی احوال و ایام کی طرف اشارہ کرنے کا یہ اسلوب ہے۔

وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ

اور ہم نے بنی اسرائیل سے کتاب میں کہہ دیا تھا کہ تم زمین میں دو مرتبہ فساد ڈالو گے

غرض کتب سابقہ کا مطالعہ اگر پوری تحقیق و تنقید سے کیا جائے تو قرآن مجید کا طالب اس سے طرح طرح کے فائدے حاصل کر سکتا ہے۔

لیکن ان کتابوں کے باب میں اللہ تعالیٰ نے مہیمن قرآن مجید ہی کو قرار دیا ہے، پس جہاں ان کتابوں میں اور قرآن میں اختلاف ہوگا، وہاں ہم قرآن کو اختیار کریں گے، ان کتابوں کو چھوڑ دیں گے۔ استاذ امام ان سے جس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں اور پھر جس طرح ان کی غلطیاں اور قرآن مجید کی حقانیت واضح کرتے ہیں اس کی مثالیں ان کی تمام تصنیفات میں مل سکتی ہیں لیکن بالخصوص رسالہ ذبیح میں ان کا زور دیکھنا چاہئے۔ سلف میں سے علامہ ابن تیمیہ کی واقفیت اہل کتاب کے متعلق براہ راست معلوم ہوتی ہے۔

یہ چند ضروری چیزیں جو طلبۂ قرآن کے لئے نافع ہیں ہم نے بیان کر دی ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک اہم بات اور بتانے کی تھی یعنی طریقہ فکر و تدبر لیکن اس کے لئے ہم ایک مستقل سلسلہ مضامین لکھنا چاہتے

ہیں اس لئے فی الحال ملتوی کرتے ہیں۔

مگر یہ خارجی وسائل و ذرائع جو بیان ہوئے ہیں یہ سب ثانوی چیزیں ہیں اصلی امور وہی ہیں جو اس سے پہلے ہم نے تین نمبروں میں بیان کئے ہیں ان کے بغیر آدمی کے لئے یہ تمام وسائل و ذرائع یکقلم بیکار ہیں، ہاں اگر ان تمام امور کے ساتھ ان چیزوں کا پورا اہتمام ہو تو ہم کو یقین ہے کہ طالب کی راہ بہت آسان ہو جائے گی اور یہ زیادہ سے زیادہ کامیابی ہے جو اس راہ میں حاصل کی جاسکتی ہے۔ ان وادیوں کے قطع کرنے کے بعد بھی کسی شخص کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ وہ پورا قرآن سمجھ لے گا۔ اس معاملہ کا تمام تر انحصار صرف اللہ تعالیٰ کی توفیق و ہدایت پر ہے، وہی راہیں کھولتا ہے اور مشکلوں میں رہنمائی کی روشنی دکھاتا ہے، پس طالب قرآن کا دل ہمیشہ اسی کے سامنے جھکا رہنا چاہئے۔ جو کچھ مل جائے اس کے لئے شکرگذار ہو۔ اور جو نہ ملے اس کے لئے امیدوار رہے، مگر نہ تو فخر کرے نہ کبھی مایوس ہو۔ اور تجارت و حصول شہرت کا ذریعہ تو قرآن مجید کو کبھی نہ بنائے آج جو لوگ ان راہوں سے گذرے بغیر تحقیق و اجتہاد کے مقامات عالیہ تک پہنچ گئے ہیں، ہماری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی حفاظت میں رکھے۔

حروف مقطعات

از مولوی بدر الدین صاحب اصلاحی

مدراس سے ایک محترم بزرگ نے حروف مقطعات اور بعض دوسری چیزوں کے متعلق استاذ امام علامہ فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے خیالات دریافت فرمائے ہیں۔ ہم کو افسوس ہے کہ بجز ان چیزوں کے جن کو مولاناؒ نے اپنی مطبوعہ تصنیفات میں لکھ دیا ہے، کسی چیز کے متعلق ہم مولانا کے خیالات تعیین کیساتھ نہیں پیش کر سکتے۔ زیادہ سے زیادہ جو کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ان کے جو خیالات حافظہ میں محفوظ ہیں ان کو اپنے لفظوں میں بیان کر دیں۔ ان کے اصلی خیالات پوری شرح و تفصیل کے ساتھ اسی وقت معلوم ہو سکیں گے جب ان کی تصنیفات شائع ہو جائیں۔ آج کی صحبت میں حروف مقطعات پر بحث کریں گے۔ انشاء اللہ آیندہ اشاعتوں میں محترم مستفسر کے دوسرے سوالات پر بھی گفتگو ہوگی۔

حروف مقطعات کو مقطعات کیوں کہتے ہیں؟ چونکہ ان حرفوں کی قرات عام حروف کے خلاف ہے۔ یعنی یہ حروف ہمیشہ الگ الگ کرکے ساکنۃ الاواخر پڑھے جاتے ہیں، مثلاً الٓمٓ کو الف، لام، میم پڑھیں گے۔ اس لئے ان کو "مقطعات" کہا جاتا ہے۔

یہ حروف قرآن مجید میں جہاں جہاں آئے ہیں، سورتوں کے بالکل شروع میں آئے ہیں۔ اور ان کے مواقع پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ حروف جن سورتوں کے شروع میں آئے ہیں ان سورتوں کے نام ہیں۔

قرآن مجید میں اکثر جگہ ان حرفوں کے بعد ذٰلِکَ اور تِلْکَ وغیرہ کے الفاظ ملتے ہیں، مثلاً سورۂ لقمان میں فرمایا گیا ہے۔

الٓمٓ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْحَکِیْمِ	الم یہ کتاب حکیم کی آیتیں ہیں۔

سورۂ الشعراء میں آیا ہے:

طٰسٓمٓ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ	طسم یہ کتاب مبین کی آیتیں ہیں۔

سورۂ حجر میں ہے۔

الٓرٰ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِیْنٍ	الر یہ کتاب اور قرآن مبین کی آیتیں ہیں۔

سورۃ البقرہ میں ہے

الٓمٓ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ	الم یہ آسمانی کتاب ہے جس میں کوئی شبہ نہیں

اس قسم کی آیتیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔

ان تمام آیتوں میں حروف مقطعات کے بعد ہی فرمایا گیا ہے کہ "تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ" یہ کتاب آسمانی کی آیتیں ہیں" ذٰلِکَ الْکِتٰبُ" یہ کتاب ہے۔ اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس اسم اشارہ کا مشارٌالیہ کون ہے؟ یہ تو معلوم ہے کہ قرآن نے ان تمام مقامات میں اسماء اشارہ میں سے صرف "ذٰلِکَ" اور "تِلْکَ" استعمال کئے ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ ذٰلِکَ اور تِلْکَ عام طور پر ما سبق ہی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے خاص ہیں اور اہل نحو جو یہ کہتے ہیں کہ یہ اشارہ بعید کے لئے ہیں تو اس سے ان کی مراد یہی ہوتی ہے۔ ارباب تفسیر جو ذٰلِکَ کو ھٰذا کے معنی میں لیتے ہیں تو محض تقریب فہم کیلئے یہ کہتے ہیں ورنہ مطلب ان کا بھی یہی ہوتا ہے۔ یہ بحث تفصیل کی محتاج ہے کسی موقع پر ہم اس پر مفصل لکھیں گے۔ اسلئے یہی حروف مقطعات کو جو ان کے پہلے مذکور ہیں، ان اسماء اشارہ کا مشارٌالیہ ماننا پڑیگا۔ اگر ان حرفوں کو مشارٌالیہ نہ مانئے تو پھر ذٰلِکَ کو ھٰذا کے معنی میں لینا پڑے گا۔ اور ان دونوں میں

جو عظیم فرق ہے وہ زبان کے جاننے والوں سے مخفی نہیں، خود قرآن مجید میں اس فرق کی متعدد واضح مثالیں موجود ہیں۔ پس جب یہی حروف ان اسمار اشارہ کے مشارٌ الیہ ہیں، تو پھر آیت کا ترجمہ یہ ہوا کہ "یہ (یعنی الٓمٓ) کتاب حکیم کی آیتیں ہیں"۔ جس کو دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ سورہ جس کا نام الٓمٓ ہے کتاب حکیم کی آیتیں ہیں۔

غور کیجئے آیتوں کے سیاق اور لفظوں کے اشارہ سے یہ بات کسقدر واضح ہے کہ یہ حروف سورتوں کے نام ہیں۔

اس موقع پر ایک اہم مغالطہ کو رفع کر دینا ضروری ہے۔ اس سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ جب یہ سورتوں کے نام ہیں تو ان کو قرآن سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ حروف گو سورتوں کے نام ہیں لیکن پھر بھی منجملۂ قرآن ہیں، دو وجہوں سے، ایک تو یہ کہ جیسا اوپر گذر چکا، قرآن نے انہی حرُف کو مشارٌ الیہ قرار دیا ہے۔ پس قرآن جب خود ان کی طرف اشارہ کر رہا ہے تو وہ حروف بھی قرآن ہی میں داخل ہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ حروف بھی قرآن ہی کے ساتھ نازل ہوئے ہیں۔ اس لئے ان کو کسی طرح ترک نہیں کیا سکتا، مابین الدفتین جو صحیفہ ہمارے پاس موجود ہے وہ عہد رسالت سے حرف بحرف محفوظ و مصئون چلا آتا ہے اور ہم کو اسی کی قرأت و تلاوت کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لئے ان حروف مقطعات کو کسی طرح بھی قرآن سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں ایک شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ بعض سورتوں کے نام ایسے حروف سے رکھنا جن کے معنی عمیق و مستور ہیں قرآن کے عربی مبین ہونے کے منافی ہے۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ تمام حروف ہجا عربوں کو معلوم تھے۔ اور ان کی عام بول چال میں انکا رواج تھا اس لئے تمام مفرد اسمائے سور مثلاً صٓ، قٓ، نٓ عربی مبین کے حکم میں ہیں۔ باقی رہے مرکبات مثلاً حمٓ، الٓمٓ، المص، حمٓعسٓقٓ تو جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ یہ ان سورتوں کے نام ہیں جن کے شروع میں یہ واقع ہیں تو یہ بھی

عربی مبین کے حکم میں داخل ہوگئے۔ اگر اس پر یہ اعتراض کیا جائے کہ اہل عرب ان کلمات سے بالکل ناواقف تھے تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ عرب اس طرح کے مرکبات سے نام رکھتے تھے۔ اور ان کے معنی بالکل ایسے مخصوص اصطلاحی قرار دے لیتے تھے جو ان کے مفردات سے نہیں سمجھے جاسکتے تھے۔ ان کے اشخاص گھوڑوں، جھنڈوں، تلواروں کے اسمار میں اس کی مثالیں تلاش سے دستیاب ہوسکتی ہیں آہستہ آہستہ یہ اسمار اس وضع جدید کے لئے متعارف ہوجاتے تھے اور سامع ان کو سنکر ان سے اس جدید معنی کو سمجھ جاتا تھا اس لئے یہ مرکب اسمار بھی عربی مبین کے حکم سے خارج نہیں ہوئے۔ لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی سورہ کا نام الم کسی کا الٓر کسی کا طٰسٓمٓ کیوں رکھا گیا؟ ان ناموں میں اور ان سورتوں میں جن کے شروع میں یہ حروف آئے ہیں، کوئی معنوی ربط اور مناسبت بھی ہے، یا نہیں؟

اگلے علمار نے بھی اس حقیقت کے کھوج میں بڑی بڑی تحقیقیں کی ہیں اور جہاں تک ہم کو معلوم ہے اس بارہ میں ان کے ۲۹ اقوال ہیں۔ لیکن ان تمام اقوال میں سے کسی قول میں بھی قرآن سے تمسک نہیں کیا گیا ہے۔ اس لئے ہم ان اقوال سے کوئی بحث نہیں کریں گے۔ قرآن کی روشنی میں ہم نے جو معنوی مناسبت سمجھی ہے صرف اسی کے بیان پر اکتفا کریں گے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اگر اس حقیقت مستور کی طرف قرآن کے اشاروں کی روشنی رہنمائی نہ کرتی تو ہم اس بحث کو ہاتھ نہ لگاتے

ولکنی انست نارا لعلی اتیکم منہا بقبس واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم۔

عربوں کا یہ دستور تھا کہ جب وہ کسی چیز کا نیا نام رکھتے تو اس چیز کا خاص خیال رکھتے کہ اسم اپنے مسمی کی مخصوص خصوصیات کا حامل ضرور ہو۔ عربوں کے القاب پر نگاہ ڈالو تو یہ حقیقت آسانی سے سمجھ میں آجائیگی "الملک الضلیل" امرا القیس کا لقب ہے۔ دیکھو یہ مختصر لقب، صاحب لقب کی مخصوص خصوصیات کا کس درجہ حامل ہے؟ اور ہونا بھی یہی چاہئے کیونکہ اسم دراصل وسم سے مشتق ہے۔

پس اہمیت کے لئے وہی چیز صالح اور مناسب ہوسکتی ہے جو علامت کا کام دے سکے۔ اس لئے ضروری ہے کہ جب کسی چیز کا کوئی نام رکھا جائے تو اس میں اتنی صلاحیت تو ضرور ہو کہ اگر سب نہیں تو کمی کی بعض ابھری ہوئی اور نمایاں خصوصیتوں کو واضح کرسکے۔ قرآن مجید میں جو سورتوں کے نام رکھے گئے ہیں ان میں اسی طرح کی کوئی نہ کوئی خصوصیت ہوتی ہے۔ ان ناموں سے کم ازکم ان سورتوں کی کوئی نمایاں علامت ضرور سامنے آجاتی ہیں۔ پس جب یہ ثابت ہوچکا ہے کہ حروف مقطعات بھی سورتوں کے نام ہیں تو ضروری ہے کہ یہ حروف بھی با معانی ہوں۔ اور ان حروف سے جو مرکبات بنائے گئے ہیں وہ بھی عربی زبان کے عام مرکب ناموں کی طرح با معانی ہوں۔

یہ معلوم ہے کہ قدیم عربی زبان میں ہندی اور انگریزی کی طرح حرفوں کے نام مجرد آوازوں کے نام نہیں تھے بلکہ یہ نام درحقیقت چیزوں کے نام ہوتے تھے۔ اور انہی کی شکلوں پر بنائے جاتے تھے آج بھی باوجودیکہ زبان پر ہزاروں انقلابات آچکے ہیں اور بے شمار تبدیلیاں ہوچکی ہیں، بہت سے حروف انہی چیزوں کے ناموں کے لئے بولے جاتے ہیں اور کسیقدر انہی کی شکلوں میں لکھے بھی جاتے ہیں، عربی حروف کے ناموں کے اصل معانی کے بعض گوشے ظاہر ہوچکے ہیں مثلاً الف اپنی اصل اور قدیم شکل میں گائے کے سر کی شکل کا ہوتا تھا۔ اور الف گائے کا نام تھا۔ اور با عبرانی زبان میں بیت کا نام تھا جس کو عربی میں بیت کہتے ہیں اور جیم عبرانی میں جمل کو کہتے تھے جس کو عربی بھی جمل کہتے ہیں۔ غور کرو ج کی موجودہ شکل اونٹ کی بگڑی ہوئی صورت سے کسقدر ملتی جلتی ہے۔

ہم نے جس حقیقت کی طرف اوپر اشارہ کیا ہے وہ نہایت معروف ہے۔ عربی کتابت کی تاریخ جاننے والے اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ موجودہ عربی حروف، دراصل عبرانی حرفوں کی مہذب شکلیں ہیں۔ اور عبرانی حروف عرب کے قدیم حرفوں سے ماخوذ تھے۔ اہرام مصر پر قبطیوں کی نشانی کتابت کے جو کتبے ملے ہوئے ہیں وہ تمام کے تمام قبطیوں نے عربوں ہی سے سیکھے تھے لیکن چونکہ ایک چیز دوسرے قالب میں جاکر کچھ نہ کچھ ضرور بدل جاتی ہے اس لئے

عربوں کے تمثالی حروف جب قبطیوں کے ہاتھ میں پہنچے تو انھوں نے اپنے افکار و عوائد کے مطابق بہت کچھ ان میں تبدیلیاں کر دیں۔ اس طرح پر عرب قدیم کی تمثالی کتابت مشکوک و مشتبہ ہو کر رہ گئی۔

عربی حرفوں کے ناموں کے متعلق اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ کوئی افسانہ یا من گڑھت بات نہیں ہے اگر غور کیجئے تو خود قرآن مجید بھی اس راز کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔ مثلاً دیکھئے قرآن مجید نے ایک سورہ کا نام ن رکھا ہے۔ ن ایک ایسا حرف ہے جو موجودہ عربی زبان میں بامعنی سمجھا جاتا ہے۔ نون کے معنی مچھلی کے ہیں۔ اور جس سورہ کا یہ نام ہے اس میں حضرت یونس علیہ السلام کا تذکرہ ہے اور اللہ تعالے نے اس سورہ میں یونس علیہ السلام کو "صاحب الحوت" (مچھلی والے) ہی کے نام سے یاد بھی فرمایا ہے۔ غور کرو؛ ان تمام باتوں میں ایک متوسم کے لئے سورہ کے وجہ تسمیہ کو سمجھنے کیلئے کتنا واضح اشارہ موجود ہے۔ کیا کوئی اسم اس سے بھی زیادہ اپنے مسمی کے ساتھ ربط اور مناسبت کا حامل ہو سکتا ہے؟

پس تفصیل بالا سے جب یہ ثابت ہو چکا کہ سورہ ن کا نام ن حرف ن کی معنوی مناسبت کی بنا پر رکھا گیا ہے تو ہم کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ باقی اور سورتوں کے نام بھی جن کے نام حروف مقطعات پر رکھے گئے ہیں، ان حروف کے ابتدائی معانی کے مطابق اپنی اپنی سورتوں کے ساتھ معنوی مناسبت رکھتے ہوں گے۔ اس لئے اب ہمارا فرض ہے کہ ہم خط تمثالی میں حرفوں کے جو معانی رہے ہوں ان کا سراغ لگائیں۔ اگر ہم کو یہ تمام معانی صحیح صحیح معلوم ہو جائیں تو حروف مقطعات کی اقرب الی الصحۃ تاویل متعین کی جا سکتی ہے۔ ہمارے اس خیال کی تائید ایک اور حرف سے بھی ہوتی ہے۔ جس کو ہماری بولی میں ط کہتے ہیں، ط کی صورت عبرانی زبان میں ٹ ہے اس کی ظاہری صورت عین اس کی معنوی حقیقت کے مطابق ہے۔ عبرانی زبان میں ط کے معنی سانپ کے ہیں اور دیکھئے یہ حرف بنایا بھی گیا ہے بالکل سانپ ہی کی صورت پر۔ حرف کی اس صورت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک سانپ ہے جو اپنے سر کو اٹھائے ہوئے کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ اب حرف کی اس حقیقت کو سامنے رکھکر غور کیجئے

تو سمجھ میں آتا ہے کہ جن سورتوں کے نام میں ط ہوگا، ان کو سانپ سے کسی نہ کسی طرح کی مناسبت ضرور ہوگی۔ اچھا آیئے قرآن مجید میں ان سورتوں کی تلاوت کریں جو ط سے شروع ہوتی ہیں اور دیکھیں کہ اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے یا نہیں؟ قرآن مجید میں ایک سورہ ہے جس کا نام ہے طٰہٰ۔ اس سورہ میں ابتدائی تمہید کے بعد ہی فوراً موسیٰ علیہ السلام کی حکایت اور ان کے عصا کے سانپ بنجانے کا معجزہ بیان فرمایا گیا ہے۔ دیکھئے اس سورہ میں سورہ کے نام اور اس کے مسمی میں کتنی واضح معنوی مناسبت موجود ہے۔ سورہ طٰہٰ کے علاوہ اور دوسری سورتیں بھی جن کو اللہ تعالیٰ نے ط سے شروع فرمایا ہے مثلاً طٰسٓمٓ، طٰسٓ، اور طٰسٓمٓ سب کی سب موسیٰ علیہ السلام کے قصے سے شروع ہوتی ہیں اور سب میں ان کے عصا کے سانپ بنجانے کا تذکرہ صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ پھر اس نکتہ کو بھی سامنے رکھئے کہ ان چار سورتوں۔ (طٰہٰ، طٰسٓمٓ، طٰسٓ، طٰسٓمٓ) کو جو ط سے شروع ہوتی ہیں چھوڑ کر باقی تمام سورتوں کی دو قسمیں ہیں، کچھ سورتیں تو ایسی ہیں جس میں سرے سے حضرت موسیٰؑ کا قصہ ہی مذکور نہیں ہے۔ اور اکثر سورتیں ایسی ہیں جن میں موسیٰ علیہ السلام کا قصہ تو مذکور ہے لیکن لٹھیا کے سانپ بننے کا واقعہ مذکور نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن سورتوں میں لٹھیا کے سانپ بننے کا واقعہ مذکور تھا وہی اس نام کی مستحق تھیں۔ اور ط کا تسمیہ انہی سورتوں کو سزاوار تھا۔ پورے قرآن میں صرف سورۃ الاعراف ایک ایسی سورہ ہے جس نے عصا کے سانپ بننے کا معجزہ بھی بیان کیا ہے اور اسکے ابتدا میں ط بھی نہیں ہے۔ لیکن اس سے ہمارے نظریہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا ہے۔ اس سورہ کو امعان نظر سے پڑھو تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سورہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ حضرات انبیاء سابقین۔ حضرت نوح، ہود، صالح، لوط، شعیب علیہم السلام کے قصوں کے سلسلہ میں تبعاً آگیا ہے۔ اسی وجہ سے اس سورہ کو ط سے نہیں شروع کیا گیا۔ ورنہ جن سورتوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس قصہ کو بطور اصل کے بیان فرمایا گیا ہے۔ آپنے دیکھا کہ ان تمام سورتوں کو

طٰ سے شروع کیا گیا تھا۔ طٰ والی تمام سورتیں حضرت موسیٰ کے لئے مخصوص ہیں ان سورتوں کو حضرت موسیٰ کیلئے مخصوص قرار دینا تنہا ہمارا ہی خیال نہیں ہے۔ بعض علمائے متقدمین نے بھی یہی سمجھا ہے۔ سخاوی کا قول ہے کہ سورہ طٰہٰ کا نام سورہ کلیم ہے اور ہذلی نے بھی کامل میں اس سورہ کا نام سورہ موسیٰ لکھا ہے۔

بہرحال ان تمام تفصیلات سے یہ تو معلوم ہوگیا کہ جن سورتوں کے تہجی ناموں میں طٰ موجود ہے ان کے ناموں میں اور مسمیٰ میں نہایت ہی گہری معنوی مناسبت ہے اسی طرح دائرہ فکر و نظر کو اگر اور وسیع کیجئے تو سمجھ میں آتا ہے کہ الٓمٓ اور الٓرٰ کی قسم کے ناموں میں بھی انکی سورتوں کے ساتھ خاص معنوی مناسبت پائی جاتی ہے۔ اور یہ گذر چکا ہے کہ خط تمثالی میں الف کی شکل گائے کے سر کے طرح ہوتی تھی نیز یہ حرف ان کے نزدیک " الٰہ واحد" پر دلالت کرتا تھا۔ قرآن مجید کو گہری نظر سے مطالعہ کرنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ جن جن سورتوں کے نام کے شروع میں الف آیا ہے۔ " ایمان باللہ " ان کے اعظم مطالب میں سے ہے۔ اس لئے ان ناموں کے متعلق بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنے اپنے مسمیٰ سے گہرا ربط نہیں رکھتے ہیں۔

یہ چند مثالیں ہیں۔ اگر اسی طرح ہر حرف کے متعلق صحیح معلومات حاصل کی جاسکیں، تو امید ہے کہ تمام حروف مقطعات کی مناسبت واضح ہوسکتی ہے، لیکن اس میں پوری کامیابی صرف اللہ تعالےٰ کی ہدایت و رہنمائی ہی سے ممکن ہے۔ مگر یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ کسی چیز سے ناواقفیت اس کے عدم کو مستلزم نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک چیز موجود ہو مگر ہم اس سے واقف نہ ہوں، پس تلاش جاری رہنی چاہئے اور خدا پر پورا بھروسہ رکھنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ ہر مشکل میں مدد فرماتا ہے۔

خلوص

از جناب مولوی داؤد اکبر صاحب اصلاحی

مذہب اسلام کوئی خیالی مذہب نہیں ہے۔ سراسر عمل اور یکسر جد وجہد ہے۔ اس کے نزدیک علم کے بعد عمل کا ظہور ضروری ہے۔ اگر اس میں تخلف ہو تو ایسا علم ایک لفظ بے معنی ہے جس کی اس کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں، یہودیوں کے دعوائے ایمان کو کیوں بے حقیقت کہا گیا؟ منافقین کے عقاید کو کیوں بے بنیاد قرار دیا گیا؟ اگر ان سوالات پر غور کیجئے تو آپ تسلیم کریں گے کہ ان کے علم اور ایمان سے جیسے اعمال بطور نتیجہ کے ظہور میں آنے تھے اس کا کوئی اثر بھی ان کی عملی زندگی میں موجود نہ تھا بلکہ اس کے برعکس ان سے ایسی حرکتیں صادر ہوتی تھیں جو اہل ایمان کے لئے کسی طرح بھی جائز نہیں ہیں اس لئے قرآن پاک نے نہ صرف یہی کہا کہ تم ایمان میں کچے ہو بلکہ ان کو سرے سے مومنین کے زمرہ ہی سے خارج کر دیا (۸ - ۹ بقرہ)

ایک طرف تو مذہب میں عمل کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ اس کے بغیر دعوائے ایمان سراب سے زیادہ نہیں۔ دوسری طرف میدان عمل میں اترنے سے پہلے ہر شخص سے اس کا ایک اور مطالبہ بھی نہایت شدت سے ہے جس کے بغیر انسان کے کسی عمل کی کوئی قیمت نہیں۔ یعنی خلوص۔ واقعہ یہ ہے کہ منہ سے کسی کی عقیدت و محبت کا دم بھرنا اور شئے ہے اور اس کی محبت کے لئے دنیا کے تمام رشتوں اور ناتوں کو تج کر کے بس اسی کا ہو رہنا اور چیز ہے۔ ایک سرتاسر فریب ہے دوسرا حقیقت۔

خلوص تمام تعلیمات دین کی اساس ہے | قرآن مجید اور دیگر صحف سماویہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خلوص مذہب کی تمام تعلیمات کی جان ہے خواہ وہ تعلیمات کلیات دین سے متعلق ہوں یا عام عبادات و معاملات سے۔ اس کے بغیر نہ تو عقیدۂ توحید، عقیدۂ توحید ہے اور نہ معاد و رسالت کا اعتقاد اعتقاد ہے۔ نہ روزہ و نماز کی کوئی حقیقت ہے۔ سورہ بقرہ میں ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ	اور لوگوں میں کچھ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم خدا
وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ	اور یوم آخر پر ایمان لائے حالانکہ وہ سچے مومن نہیں ہیں
يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	وہ خدا کو اور مسلمانوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں حالانکہ
وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ	وہ اپنے آپ ہی کو دھوکا دیتے ہیں لیکن ان کو
وَمَا يَشْعُرُوْنَ (۸ - ۹ بقرہ)	خبر نہیں۔

ایک دوسرے مقام پر یوں مذکور ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ	اے رسول جو شخص زبان سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان
يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ	لائے اور ان کے دل مومن نہیں ہیں، کفر کی
قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ	راہ میں ان لوگوں کی بھاگ دوڑ تم کو غم میں
قُلُوْبُهُمْ آیۃ ۴۱ - مائدہ)	نہ ڈالے۔

مذکورہ بالا آیات سے صاف ظاہر ہے کہ چونکہ منافقین کا دعویٰ ایمان خلوص سے خالی تھا اسلئے انھیں مومنین کے زمرہ سے یکقلم خارج کر دیا ہے۔

حضرت مسیح سے بھی جب پوچھا گیا کہ اے استاد شرع میں سب سے بڑا حکم کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا "خداوند کو جو تیرا خدا ہے اپنے سارے دل اور اپنی ساری روح اور اپنی ساری عقل سے پیار کر سب سے پہلا اور سب سے بڑا حکم یہی ہے"۔ (متی - ۲۲)

حضرت مسیحؑ کے اس قول میں ایک بہت ہی گہری حقیقت کی جانب ایک نہایت لطیف اشارہ ہے وہ یہ کہ محبت الٰہی خلاصہ کتاب اور بنیاد شریعت ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ شریعت کا سرچشمہ یہی ہے۔ تمام عقائد و اعمال یہیں سے ابلتے ہیں اور جملہ اخلاق و معاملات کا یہی مرکز ہے۔ مگر خدا کی محبت میں جلا اسی وقت آسکتی ہے جب تمام باطل اثرات کو بالکل مٹا کر انسان بس اسی ایک کا ہو رہے، لفظ ساری کی قید اور تکرار میں یہی رمز ہے۔

خلوص عبادت کی روح رواں ہے | مذہب اسلام میں ہر عمل جو خلق خدا کی فائدہ رسانی اور خدا کی خوشنودی کیلئے کیا جائے عبادت میں داخل ہے اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد اس کے بڑے بڑے ارکان ہیں۔ مگر ان میں سے ہر فریضہ کی ادائگی کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے دل میں خلوص ہو، نہ اس میں ریا و نمائش کی خواہش ہو اور نہ کسی طمع و خوف کا دباؤ۔ ورنہ اسکی تمام عبادت اکارت ہو جائے گی

نماز میں خلوص شرط ہے | قرآن پاک میں بہت سی ایسی آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کیلئے ضروری ہے کہ وہ ریا و نمائش سے پاک ہو۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَنْ	پس تباہی ہے ان نمازیوں کے لئے جو اپنی
صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ الَّذِينَ هُمْ	نماز سے غافل ہیں وہ جو نمائش کرتے ہیں اور چھوٹی
يُرَاءُونَ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ (ماعون)	چیز بھی مانگے نہیں دیتے۔

حضرت مسیحؑ نے بھی اس نماز کی جس میں ریا و نمائش کا شائبہ ہو نہایت سختی سے مذمت کی ہے فرماتے ہیں۔

"اور جب تو دعا مانگے ریاکاروں کے مانند مت ہو کیونکہ وہ عبادت خانوں میں اور راستوں کے کونوں پر کھڑے ہوئے دعا مانگنے کو دوست رکھتے ہیں تاکہ لوگ انہیں دیکھیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ

دو اپنا بدلہ پا چکے لیکن جب تو دعا مانگے اپنی کوٹھری میں جا اور اپنا دروازہ بند کرکے اپنے باپ سے جو پوشیدگی میں ہے دعا مانگ (متی-۶)

زکوٰۃ میں بھی خلوص شرط ہے | قرآن پاک اور دیگر صحائف میں بے شمار ایسی آیات مذکور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ یا کوئی دوسری پیشکش اس وقت تک خدا کی بارگاہ بے نیاز میں شرف قبولیت حاصل نہیں کر سکتی جب تک کہ اس میں پورا خلوص نہ ہو۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ	اور ان لوگوں کے کام کی مثال جو خدا کی رضا جوئی
ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ	اور اپنے نفس کی تثبیت کے لئے اپنا مال خرچ
اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ	کرتے ہیں ایسی ہے جیسے ایک باغ بلندی پر
اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا	واقع ہے جب پر پانی پڑا تب لایا اپنا پھل دوگنا
ضِعْفَيْنِ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ	اگر پانی نہ پڑا تو شبنم ہی اس کو کافی ہوئی اور
فَطَلٌّ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۲۶۵ بقرہ)	خدا تمہارے اعمال سے خوب واقف ہے۔

فرمایا "ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ" خدا کی رضا جوئی کے لئے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ خدا کی راہ میں تھوڑا بہت خلوص نیت کے ساتھ خرچ کرتے ہیں انہی لوگوں کا انفاق قبول ہوگا اور جو لوگ اس مقصد سے خالی ہوں گے اگر وہ ہفت اقلیم کی سلطنت بھی خدا کی راہ میں لٹا دیں تو اس کا کوئی اجر نہیں ہے۔

ایک دوسری جگہ یوں مذکور ہے۔

وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ	اور اس پر کسی کا احسان نہیں کہ اس کا بدلہ دینا
تُجْزٰٓى اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ	ہو محض اپنے برتر پروردگار کی خوشنودی کے لئے
الْاَعْلٰى وَلَسَوْفَ يَرْضٰى	اور جلد وہ نہال ہو جائے گا۔

ایک دوسرے مقام پر یوں ہے۔

اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (۲۷۔ مائدہ) خدا تو تقویٰ والوں ہی کی پیشکش قبول فرماتا ہے

اس آیت میں تصریح ہے کہ خدا کی بارگاہ بے نیاز میں اسی کی پیشکش شرف قبولیت حاصل کر سکتی ہے جو خلوص کا ہدیہ لیکر آتے ہیں ریاکاروں اور شہرت پسندوں کے نذرانوں کی اس کے دربار میں کوئی قیمت نہیں ہے۔

اسی حقیقت کو حضرت مسیحؑ نے بھی بیان فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"خبردار رہو کہ تم اپنے نیک کاموں کو لوگوں کے سامنے دکھلانے کے لئے نہ کرو نہیں تو تمھارے باپ سے جو آسمان پر ہے اجر نہ ملے گا، اس لئے جب کہ تو خیرات کرے اپنے سامنے نرسنگی مت بجا جیسے ریاکار عبادت خانوں اور راستوں میں کرتے ہیں تاکہ لوگ ان کی تعریف کریں میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اجر پا چکے، جب تو خیرات کرے تو چاہئے کہ تیرا بایاں ہاتھ نہ جانے جو تیرا دایاں ہاتھ کرتا ہے تاکہ تیری خیرات پوشیدہ رہے اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے ظاہر میں تجھے بدلہ دے۔ (متی باب ۶)

روزہ میں بھی خلوص شرط ہے قرآن مجید میں غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ کا اصلی مقصود حصول تقویٰ ہے اس لحاظ سے روزہ میں سب سے مقدم شے خلوص ہی کو ہونا چاہئے کیونکہ بغیر اس کے روزہ سے تقویٰ کا حصول ناممکن ہے۔ سورہ بقرہ میں فرمایا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۱۸۳ بقرہ)

اے مسلمانو! تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جیسے ان لوگوں پر فرض کیا گیا جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں تاکہ تم متقی ہو جاؤ۔

حضرت مسیحؑ نے بھی روزہ میں خلوص نیت کو ضروری شرط قرار دیا ہے۔ فرمایا ہے

"جب تم روزہ رکھو ریاکاروں کی مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ کیونکہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں کہ

لوگوں کے نزدیک روزہ دار ظاہر ہوں میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا بدلہ پاچکے، پر جب تو روزہ رکھے اپنے سر پر چکنائی لگا اور منہ دھو تاکہ تو آدمی پر نہیں بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے روزہ دار ظاہر ہو اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے آشکارا تجھے بدلہ دے۔ (متی - باب ۶)

حج میں بھی یہ اصل ملحوظ ہونی چاہئے حج اسلام کا ایک بہت بڑا رکن ہے اور تمام ارکان کی طرح اس کی مقبولیت کے لئے بھی قرآن مجید اور احادیث میں خلوص کی شرط لگائی گئی ہے۔ بغیر اس کے یہ عظیم الشان عبادت بالکل رائگاں ہے۔ سورہ بقرہ میں فرمایا ہے۔

...... فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُوْلُ	... ... لوگوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے
رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ	ہیں کہ اے پروردگار ہمیں دنیا میں تو دست دے
مِنْ خَلَاقٍ وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُوْلُ	اور ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور کچھ
رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي	لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں اے پروردگار ہماری
الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ	دنیا بھی بہتر بنا اور آخرت بھی، اور ہمیں عذاب جہنم
النَّارِ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا	سے بچا یہی لوگ ہیں جنھیں ان کے اعمال کی (پوری)
وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۲۰۰-۲۰۲ بقرہ)	جزا ملے گی اور خدا جلد حساب کرنے والا ہے۔

اس دعا کے اوپر کے حصہ میں ان لوگوں کی ترجمانی ہے جن کی تمام طلب و جستجو صرف دنیا کیلئے ہے۔ آخرت کی زندگی کی نہ انھیں خبر ہے اور نہ اس کے لئے کوئی تلاش اور بے چینی۔ وہ حج کے لئے بھی سفر کرتے ہیں تو ان کے پیش نظر صرف ان کے دنیاوی اغراض و مقاصد ہوتے ہیں اور انہی کے لئے خدا سے دعائیں کرتے ہیں۔

جہاد میں بھی خلوص کی شرط ہے قرآن پاک میں جہاں جہاد پر زور دیا گیا ہے اکثر مقامات میں "فی سبیل اللہ" کی قید لگائی گئی ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ یہ کام محض اللہ کی راہ میں ہونا چاہئے۔ طلب دنیا، تمنائے شہرت

اور عشق ناموری میں نہیں ہونا چاہئے ورنہ تمام عمل باطل ہو جائے گا۔

مسلم کی ایک حدیث میں، اس حقیقت کی پوری تصویر کھینچ دی گئی ہے۔

قیامت کے دن سب سے پہلے شہید کا معاملہ عدالت الٰہیہ میں پیش ہوگا۔ پس خدا اسے اپنی نعمتیں پہچنوائے گا پس وہ انھیں پہچان لے گا تو خدا فرمائے گا کہ تو نے کون سا کام کیا ہے تو بندہ کہیگا بارالٰہا! تیری راہ میں میں لڑا یہاں تک کہ درجہ شہادت تک پہنچ گیا تو خدا فرمائے گا تو جھوٹا ہے تو محض اس لئے لڑا کہ جاں باز کہا جائے سو یہ مقصد تو حاصل ہو گیا پھر حکم ہوگا کہ اسے گھسیٹ کر جہنم میں ڈالدیا جائے۔ (مسلم جلد ۲ ص ۱۴۳)

"مسلم" پٹنہ کا انقلابی دور

مدیر مسئول:- سید محمد منظر ندوی۔ مدیران خصوصی:- مولانا عبدالباقی بی اے جامعی، مولانا اسمٰعیل چشتی ایم اے، مولانا سید محی الدین ندوی۔

ہفتہ میں دو بار پابندیٔ وقت کے ساتھ ۸ صفحات پر شائع ہوتا ہے سالانہ چندہ ۶ روپیہ ششماہی ۳ روپیہ سہ ماہی ڈیڑھ روپیہ۔ فی پرچہ تین پیسے۔

پانچ سال کی مستقل زندگی کے بعد مسلم کا دور جدید شروع ہو گیا ہے مسلم کا اداره تحریر ہندوستان کے کسی بہتر سے بہتر جریدہ کے صوری و معنوی محاسن کا ضامن ہو سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ "مسلم" گوناگوں دلچسپیوں اور ادبی شاہکاروں کا بہترین مرقع سمجھا جا رہا ہے۔ اہم ترین مقالوں، ضروری شذرات اور نوبہ نو خبروں کے علاوہ بصیرت افروز نظمیں، عالم اسلام، معلومات و انکشافات وغیرہ کے مستقل عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں "آئینۂ عالم" کے جدید عنوان کے ماتحت سیاسی دنیا کی تازہ ترین سیاسیات پر نئے اسلوب بیان میں روشنی ڈالی جاتی ہے یہ "مسلم" کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔ عنوان "علم و ادب" کوئی خشک موضوع نہیں بلکہ علم و ادب کیلئے زندگی کا پیغام ہے اور یہ جذبہ میں دبی زندگی کی روح پھونکنا چاہتا ہے "پتے کی باتوں" میں دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کیجاتی ہے۔ "تفکہات" کے مزاحیہ کالم میں دل بہلانے کا کافی ذخیرہ موجود رہتا ہے۔

اگر آپ نئے مضامین، نیا طرز بیان اور نئی باتوں سے بہرہ ور ہونا چاہتے ہیں تو آج ہی سے "مسلم" کے خریدار بنجائیے۔

ملنے کا پتہ:- مینیجر اخبار "مسلم" بانکی پور (پٹنہ)

ایفائے عہد اسلام اور تہذیب جدید کی نظر میں

از جناب حافظ عبدالاحد صاحب اصلاحی

انسانی اخلاقیات کے باب میں ایفائے عہد کو وہی اہمیت اسلام میں حاصل ہے جو اہمیت جسم کے اندر روح کو حاصل ہے چنانچہ اسلام نے ایفائے عہد کو انسانیت کا اصلی جمال اور مجد و شرف کا نشان ٹھہرایا ہے اور جنگ و صلح، دشمنی اور دوستی دونوں حالتوں میں وفائے عہد کی تاکید کی ہے، قرآن پاک میں اس مضمون کی آیات بکثرت ہیں جن میں سے کچھ یہاں نقل کی جاتی ہیں، جن سے اندازہ ہو سکے گا کہ اس باب میں اسلام کا حکم کیا ہے؟۔

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ	عہد پورا کرو کیونکہ عہد کے بارے میں باز
كَانَ مَسْئُوْلًا	پرس ہوگی،
فَاَتِمُّوْا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى	ان سے پورا کرو ان کا عہد ان کے عہد
مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ	تک بیشک اللہ کو پسند ہیں احتیاط والے
وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ	اور جو کوئی پورا کرے اس چیز کو جس پر
اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا	اقرار کیا اللہ سے تو وہ اس کو دیگا بدلا
(سورہ ۴۸۔ آیت ۱۰)	بہت بڑا۔
وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ	اللہ کے عہد کو پورا کرو جب تم کسی سے
وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا	معاہدہ کرلو اور اپنی قسموں کو مضبوط کرنے

وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ۚ إِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ۚ

(سورہ ۱۶ - آیت ۹۱-۹۲)

اور اللہ کو ان پر ضامن کرنے کے بعد نہ توڑو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کا حال بالیقین معلوم ہے اور تم اس عورت کی طرح نہ بن جاؤ جس نے اپنا ہی کاتا ہوا تاگا محنت سے کاتنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تم اپنی قسموں کو باہم دغا کے طور پر استعمال کرتے ہو کہ کہیں ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ جائے۔

اَلَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَا اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ... اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ (سورہ ۱۳ آیت ۲۲)

جو لوگ اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور عہد و پیمان نہیں توڑتے اور اللہ نے جس رشتہ کو جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے جوڑے رکھتے ہیں انھیں لوگوں کیلئے آخرت کا گھر ہے۔

وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عَاهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ (سورہ ۲ - آیت ۱۷۷)

وہ لوگ جو عہد کرنے کے بعد اسے پورا کرتے ہیں اور وہ جو سختی و تکلیف اور لڑائی کی مصیبت میں ثابت قدم رہتے ہیں یہی لوگ ہیں سچے اور یہی لوگ پرہیزگار ہیں۔

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى

ہاں جو کوئی پورا کرے اپنا قرار اور وہ

فَاِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ۝ اِنَّ	پرہیزگار ہے تو اللہ کو محبت ہے پرہیزگاروں
الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَھْدِ اللّٰہِ	سے۔ جو لوگ تھوڑی قیمت پر عہد کو بیچ ڈالتے
وَاَیْمَانِھِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِکَ	ہیں ان کا کچھ حصہ آخرت میں نہیں ہے اللہ
لَاخَلَاقَ لَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ وَلَا	نہ ان سے بات کریگا اور نہ قیامت کے دن
یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْھِمْ	ان کی طرف نگاہ کرے گا اور نہ انکو پاکیزگی
یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَلَا یُزَکِّیْھِمْ وَلَھُمْ	بخشے گا ان کے لئے دردناک عذاب
عَذَابٌ عَظِیْمٌ (سورہ ۳۔ آیت ۷۰،۷۱)	ہے۔
وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ کَانَ	اور جب بات کہو تو حق کہو اگرچہ وہ شخص
ذَاقُرْبٰی وَبِعَھْدِ اللّٰہِ اَوْفُوْا	جس کے خلاف کہ رہے ہو اپنا قریب ہی ہو
ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِہٖ لَعَلَّکُمْ	اور اللہ کا عہد پورا کرو تم کو اسکا حکم کر دیا ہے
تَذَکَّرُوْنَ ۝ (سورہ ۶۔ آیت ۱۵۲)	تا کہ تم نصیحت پکڑو۔

آیات مذکورہ بالا میں بتلایا گیا ہے کہ اسلامی اخلاقیات کی بنیادی چیزوں میں سے وفاء عہد ایک نہایت اہم چیز ہے انسان کے گرد و پیش کے حالات کتنے ہی ناسازگار اور مخالف ہوں اسے اپنے عہد پر قائم رہنا چاہئے کسی حالت اور کسی شکل میں بدعہدی نہیں کرنی چاہئے۔ بدعہدی تقویٰ اور پاکیزگی نفس کے خلاف ہے۔ خدا کے نزدیک یہ عمل نہایت مبغوض ہے اور اس کا انجام حد درجہ ہلاکت خیز ہے۔ انسان کو بدعہدی سے کتنا ہی عظیم فائدہ پہنچنے کی امید ہو اور ایفائے عہد سے کتنا ہی نقصان کا خطرہ ہو، اس کو چاہئے کہ وفاء عہد کرے کیونکہ بدعہدی سے جو نفع حاصل ہوگا اس سے اس نقصان کی تلافی نہیں ہوسکتی جو انسان کے اخلاق اور روح کو اس سے پہنچتا ہے اور ایفائے عہد سے بظاہر جو نقصان ہوگا اس سے انسان کے وہ اخلاقی اور روحانی فوائد کسی طرح کم نہیں ہوسکتے جو ایفائے عہد کے لازمی

نتائج ہیں۔ انسان کیلئے لازم ہے کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں میں عہد و پیمان پر قائم رہے تاکہ اس کی زندگی پاکیزگی کی زندگی ہو۔

آنحضرت صلعم نے اس باب میں جو کچھ فرمایا ہے اس کی اہمیت کا اندازہ ذیل کی حدیث کو الفاظ سے ہوگا۔

لَادِیْنَ لِمَنْ لَاعَهْدَ لَهُ۔ (رواہ ابن حنبل فی المسند)

جس کے اندر وفاء عہد نہیں اس کے اندر دین نہیں۔

گویا ایفائے عہد پر دین کی بنیاد استوار ہے ایک مسلم کی زندگی اسی وقت تک اسلامی زندگی ہے جبتک وہ عہد پر قائم ہے

اس تعلیم کی عملی مثال قرآنی آیات و حدیث کی روشنی میں ایفائے عہد کی اہمیت یہ ہے۔ اب یہ دیکھئے عملی زندگی میں اس تعلیم کو کہاں تک اختیار کیا گیا اور اسے کتنی اہمیت دی گئی۔ ذیل کو واقعہ سے اس کی تصدیق ہوگی۔

صلح حدیبیہ میں جن شرائط کے ماتحت کفار قریش سے مصالحت طے پائی تھی ان میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ مکہ سے کوئی آدمی مسلمانوں کے پاس بھاگ کر جائے گا تو مسلمان اسے واپس کر دینگے اور مسلمانوں کا کوئی آدمی مکہ جائے گا تو کفار اسے واپس نہیں کریں گے۔ یہ معاہدہ قلمبند ہو رہا تھا کہ ابو جندل ابن سہیل جو کفار مکہ کے قیدی تھے کسی طرح ان کی قید سے چھوٹ کر لشکر اسلام میں آگئے پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہیں، جسم پر زخموں کے نشانات ہیں، چہرے پر شدت آلام کے آثار نمودار ہیں۔ سرور کونین سے آکر فریاد کرتے ہیں، خدارا اس مصیبت سے مجھے نجات دلائیے، جاں نثاران اسلام ان کی یہ حالت دیکھ کر بے قرار ہوگئے۔ چودہ سو تلواریں شہنشاہ کونین کے اک اشارہ کی منتظر تھیں اور ان کی ملی اخوت اپنے ایک مسلمان بھائی کے چھڑانے

کے لئے بھیجی تھی مگر چونکہ شرائط صلح طے پا چکی تھیں عہد نامہ لکھا جا رہا تھا اس لئے پیغمبر خدا نے حضرت ابو جندل کو چھڑانے سے انکار فرمایا حضور کے الفاظ یہ ہیں

یا ابا جندل اصبر واحتسب	ابو جندل صبر کر اللہ تعالیٰ تیرے لئے رہائی
فانا لا نغدر وان اللہ جاعل لک	کی کوئی صورت پیدا کرے گا
فرجا ومخرجا (فتح الباری باب الشروط فی الجہاد)	

جنگ بدر میں کفار کی جمعیت مسلمانوں سے سہ گنی تھی۔ مسلمانوں کو اپنی تعداد بڑھانے کیلئے ایک آدمی بھی بڑی قیمتی چیز ہو سکتا تھا، حذیفہ بن الیمان اور ان کے والد حسیل ابن جابر اسلامی فوج کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں کفار نے ان کو روک دیا اور کہا تم لوگ محمد کی اعانت کیلئے جا رہے ہو۔ انھوں نے کہا نہیں ہم لوگ مدینہ کے ارادہ سے جا رہے ہیں۔ اس پر کفار نے ان سے یہ عہد لیکر چھوڑ دیا کہ وہ جنگ میں شریک نہ ہوں گے۔ یہ لوگ کفار کی گرفت سے چھوٹ کر میدان بدر میں آئے اور آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ واقعہ دہرایا آپ نے سنکر فرمایا تم لوگ مدینہ چلے جاؤ ہم عہد کو پورا کریں گے اور ان کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ سے مدد و نصرت مانگیں گے (مسلم شریف)

صلح حدیبیہ کے بعد آپ مدینہ تشریف لائے۔ تو ابو بصیر ایک صحابی کفار مکہ کی قید سے کسی طرح نکل کر آپکے پاس حاضر ہوئے اور ان کے پیچھے پیچھے کفار کے بھی دو آدمی مدینہ پہنچے ان لوگوں نے دربار رسالت میں حاضر ہو کر ابو بصیر کی واپسی کا مطالبہ کیا رسول اللہ صلعم کو معلوم تھا کہ مکہ میں مسلمانوں کے ساتھ کتنا ظالمانہ برتاؤ ہوتا ہے اور خصوصاً بھاگ کر واپس جانے والے قیدی کے ساتھ کیا برتاؤ ہوگا مگر پاس عہد ان سب پر مقدم تھا آپ نے اس مظلوم مسلمان کو دشمنان اسلام کے سپرد کر دیا لیکن نقض عہد گوارا نہ کیا (فتح الباری باب الشروط فی الجہاد)

جنگ یرموک کے موقع پر قیصر روم کی فوج لاکھوں کی تعداد میں مسلمانوں کے مقابلہ کیلئے

جمع ہوتی ہے تمام اور فلسطین سے مسلمانوں کو نکال دینے اور ان کی قوت کو کچل دینے پر تلی ہوئی ہے
اس وقت مسلمانوں کو اپنی قوت کے تحفظ کیلئے پیسہ پیسہ کی ضرورت ہے مگراس کے باوجود وہ حمص کے
باشندوں کو جمع کرتے ہیں اور جو رقم بطور خراج ان سے وصول کی تھی اسے یہ کہکر واپس کردیتے ہیں
کہ اب ہم تمہاری حفاظت نہیں کرسکتے اس لئے یہ رقم واپس ہے۔ مسلمانوں کیلئے یہ کتنی کٹھن گھڑی ہے
ایک درم ایک دینار سے زیادہ قیمت رکھتا ہے مگر چونکہ خلاف عہد تھا اسلئے کوڑی کوڑی واپس کردی۔
یہ اور اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں لیکن یہاں واقعات کا استقصار مقصود نہیں ہے اسلئے
اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

تہذیب جدید میں ایفاء عہد کی اہمیت آج جدید تہذیب کی بڑی دھوم ہے اس کا کوئی گوشہ اچھائیوں
اور اخلاقی بلندیوں سے خالی نہیں سمجھا جاتا بلکہ ساری اچھائیوں کی مالک مہذب قومیں ہی سمجھی
جاتی ہیں مگر ایفاء عہد جو اخلاق انسانی کا روشن ترین باب ہے ان کے یہاں لکیر سادہ ہے۔
وفاء عہد کی جو قدر و قیمت ہے اس کی تفسیر لوئی یازدہم شہنشاہ فرانس کا یہ مقولہ ہے۔

"جو شخص دغا فریب سے کام نہیں لیتا وہ حکومت نہیں کرسکتا، سیاسیات میں
اصل چیز کامیابی ہے اور اس کامیابی کیلئے ہر قسم کے ذرائع استعمال کئے جاسکتے ہیں"۔

(تاریخ یورپ صفحہ ۴۴۴)

مہذب دنیا میں اس کے علاوہ ایک ایسے نظریہ اور اصول پر عمل ہو رہا ہے جو اس سے بھی
زیادہ عہد و پیمان کو بے وقعت بنا دیتا ہے۔

"جسے طاقت ہے وہ حاصل کرنے کا حقدار ہے اور قبضہ اسی کا ہے جسے قبضہ پر
قدرت ہے" (تاریخ یورپ صفحہ ۲۱۳)

"تنازع للبقاء کے محک پر آکر تمام معاہدات کی پابندی ختم ہوجاتی ہے جو بڑی بڑی

سلطنتوں میں طے پا چکے ہوتے ہیں۔" (تاریخ یورپ جدید صفحہ ۶۸۰)

یہ نظریہ محض نظریہ اور اصول تک محدود نہیں اس پر جس شدت سے عمل ہوتا ہے اس کا استقصار ناممکن ہے، تاریخ تہذیب جدید بدعہدی کے واقعات سے بھری پڑی ہے یہاں ایک آدھ واقعہ تاریخ یورپ جدید سے مثالاً نقل کرتے ہیں تاکہ ناظرین کو صحیح اندازہ ہو سکے کہ نظریہ اور عمل میں کتنا کامل اتحاد ہے۔

"وائنا اور محالفہ مقدسہ کے عہدنامجات سلاطین کی باہمی رقیبانہ کشاکش کے خلاف برسرکار لائے گئے تھے۔ اصول قومیت نے ان عہدنامجات کو درہم برہم کر کے رقابت بین الاقوامی کو جگہ دیدی۔"

"۱۸۸۳ء میں آسٹریا، جرمنی، اور اٹلی کے درمیان اتحاد ثلاثہ کے نام سے ایک عہدنامہ ہوا تھا جس کے مقاصد میں سے یہ تھا کہ اگر حلیفوں میں سے کسی ایک پر روس نے حملہ کیا تو ان میں سے ہر ایک متفقہ طور پر اس کا تدارک کریگا۔ مگر جرمنی نے اس معاہدہ کے خلاف روس سے غیر جانبدار رہنے کا ایک خفیہ معاہدہ کر لیا اور محالفہ ثلاثہ کو پس پشت ڈالدیا مئی ۱۹۱۵ء میں اطالیہ نے آسٹریا کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا حالانکہ اس کا یہ اعلان معاہدہ ۱۸۸۳ء کے بالکل خلاف تھا۔"

شاہ انگلستان اور لوئی چہاردہم کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ ہوا تھا جو معاہدہ ڈوور ([illegible]) کے نام سے مشہور ہے، شاہ انگلستان نے بوقت ضرورت لوئی چہاردہم کی مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا اسلئے ۱۶۷۲ء میں جب فرانس اور ہالینڈ میں جنگ چھڑ گئی تو ہالینڈ تن تنہا رہ گیا بالآخر انگلستان کے لوگوں نے اپنے بادشاہ کو اس وعدے کے خلاف طرز عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا جو اس نے لوئی چہاردہم سے کیا تھا انگلستان ہالینڈ

پر حملہ کرنے سے تو باز رہا اور کچھ دنوں کے بعد اس کی تائید میں الٹا فرانس پر حملہ کر بیٹھا۔

یہ نظریئے اور واقعات جو ہم نے پیش کئے ہیں مہذب قوموں کے اجتماعی اخلاق کی بنیاد اور انکے قومی اخلاق کا آئینہ ہیں تاہم شخصی اور انفرادی حیثیت سے ان کے نزدیک بھی یہ شرمناک اور قابل نفرت ہے مگر یہ تو اک اندھیر ہے اور تہذیب کی ناقابل تلافی خامکاری ہے کہ جو کام شخصی اور انفرادی حیثیت سے قابل نفرت اور شرمناک ہو وہی کام اجتماعی اور قومی حیثیت سے بے تکلف جائز ہو اس کے کرنے میں کسی قسم کا عیب نہ سمجھا جائے آج بھی یہی ہو رہا ہے۔ مدبرین سلطنت اور رہبران قوم اپنی شخصی زندگی میں کتنا ہی محاسن اخلاق کا مجموعہ ہوں مگر اپنی سلطنتوں کے مصالح اور مفاد اور اپنی قوم کی سود و بہبود کیلئے جھوٹ بولنا، وعدہ خلافیاں کرنا، ایمان وضمیر کے خلاف کام کرنا بالکل جائز سمجھتے ہیں اور بے تکلف اسکے مرتکب ہوتے ہیں گویا یہ کوئی اخلاقی جرم نہیں ہو بلکہ تدبیر وسیاست میں سب سے زیادہ دوراندیش اور مدبر وہی سمجھا جاتا ہے جو عہد شکنی میں سب سے زیادہ بیباک ہو لیکن اسلام اس معاملہ میں شخص، جماعت، راعی، رعایا، قوم اور قبیلہ یگانہ اور بیگانہ کسی میں کوئی امتیاز نہیں قائم کرتا، نقض عہد اور بدعہدی کو کسی حال میں کسی مقصد کے لئے جائز نہیں قرار دیتا۔

اجتماعی عہد و میثاق کا دائرہ اثر شخصی عہد و میثاق کا اخلاقی تمدن کی تعمیر میں ایک خاص حصہ ہے، مگر اس کا دائرہ محدود ہے اسلئے اسکے اثرات ونتائج بھی محدود ہوں گے لیکن قومی اور اجتماعی عہد و میثاق کا حال اس سے بالکل مختلف ہے اس کی فطرت میں ایک عالمگیر اخلاقی تہذیب و تمدن کی قوت تعمیر پنہاں ہے کیونکہ اسکے ذریعہ مختلف اقوام اور مختلف ممالک کو بہترین دوستانہ فضا میں ایک دوسرے کے تہذیب وتمدن اور ملکی اور قومی خصوصیات کے مطالعہ کرنے کا پورا موقع ملتا ہے اور بیخوفی کے ساتھ ساری ذہنی اور دماغی قوتیں تعمیر میں لگا دیجا سکتی ہیں۔ اجتماعی عہد و میثاق کا اثر صرف ایک جماعت اور ایک ملک ہی پر نہیں پڑتا اس کا اثر ایک قوم وملک سے گذر کر دوسری قوم

اور ملک پر پڑتا ہے۔ شخص واحد نے عہد ومیثاق کیا ہے اس کا اثر شخصی زندگی کے دائرہ کے اندر محدود ہوگا، ایک خاندان نے کیا ہے اس کا اثر زیادہ سے زیادہ وہ ایک خاندانوں تک وسیع ہوگا مگر یہی عہدوپیمان اگر ایک قوم اور ملک کے درمیان ہے تو اس کا اثر لازما پورے ملک و قوم پر پڑیگا، ایفاءعہد کی حالت میں اطمینان وسکون، دوستی اور یکجہتی کی فضا پیدا ہوگی اور اس کے برعکس بدعہدی کی حالت میں اضطراب، بےچینی اور عداوت کی فضا۔

اسلام کا بلند نقطۂ نظر اسلام چونکہ اپنے پیرؤوں کے اندر ایک عالمگیر صداقت اور راست بازی کی روح پیدا کرنی چاہتا اسلئے اس نے اس نکتہ کو پیش نظر رکھ کر ہر قسم کی بدعہدی کی قطعی ممانعت کردی اور شخصی واجتماعی دونوں صورتوں میں ایفاءعہد کو لازم قرار دیا اور اس مجرمانہ ذہنیت کی جڑ اکھاڑ کر پھینکدی جس سے قومی اور اجتماعی عہدوپیمان کی روح پامال اور طبعی امن وسکون کی فضا مکدر ہو رہی تھی جو تمدن کی جان ہے مگر تہذیب جدید کی رسائی اس حقیقت تک نہیں ہوسکی اور ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کا مقصد ایک محدود نقطۂ نظر کی تعمیر ہے بخلاف اسکے اسلام کا مقصد غیر محدود اور عالمگیر انسانیت کے نقطۂ نظر کی تعمیر ہے، پہلا مقصد محدود اور غیر وسیع ہے دوسرا عالمگیر وسیع اور بلندتر، یہی سبب ہے کہ وفاءعہد کے باب میں تہذیب کا قدم شخصی حدود تک پہنچکر رک گیا اور اس وسیع حقیقت تک نہیں پہنچ سکا جہاں اسلام کا قدم پہنچا۔

خطبات مدراس کا نیا ایڈیشن

خطبات مدراس کا مجموعہ جو سیرۃ نبوی کے تمام مباحث کا نچوڑ ہے، اور جو ہر طبقہ کے مسلمانوں میں یکساں ذوق وشوق سے پڑھا جاتا ہے، اس کا تیسرا نیا ایڈیشن مصنف کی نظر ثانی کے بعد چھپ کر تیار ہے۔ طلبہ کے مذاق کو دیکھ کر اسکی تقطیع ۱۸×۲۲/۱۸ یعنی چھوٹی رکھی گئی، لکھائی چھپائی کاغذ بہتر، ضخامت ۲۰۰ صفحے، قیمت عہ/

منیجر (دارالمصنفین اعظمگڈھ)

غزل

از جناب مرزا احسان احمد صاحب وکیل اعظم گڈھ

کیا ہوا اس شاہد پنہاں کی تمنا مجھکو — نظر آتا نہیں جب اپنا ہی جلوا مجھکو

شورش عشق میں اس کی نہیں پروا مجھکو — حال کیا ہے مرا، کیا کہتی ہے دنیا مجھکو

یوں ہی رکھنا تھا جو محروم تماشا مجھکو — کر دیا کس لیے پھر محو تماشا مجھکو

ہوں میں دیوانہ، مگر ہوش ہے اتنا مجھکو — ذرے ذرے میں نظر آتی ہے دنیا مجھکو

جذبۂ ذوق طلب کی ہے یہ مستی کیا کم — لاکھ رکھے کوئی محروم تماشا مجھکو

اور ہی کچھ ہے مری شورش دل کا عالم — غم بھی آتا ہے نظر کیف سراپا مجھکو

لذت زیست ہے وابستۂ بیتابی دل — پھر غم ہجر کا ہو کس لیے شکوا مجھکو

مست در یتیماں میں ابھرتا ہی رہا گوہر چند — موج طوفان حوادث نے ڈبویا مجھکو

تشنہ کامی ہی میں ہے عشق کا کل راز سرور — دے نہ اے ذوق ہوس دعوت صہبا مجھکو

لاکھ سامان تعیش ہوں قفس میں لیکن — بھول سکتی نہیں آزادی صحرا مجھکو

نہ تصور رہے کوئی کا نہ تمنا ہو نہ یاس

بیخودی چھوڑ دے یوں ہی کبھی تنہا مجھکو

تقریظ و تبصرہ

فکر و نشاط :- جوش ملیح آبادی۔ ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ دہلی صفحات ۱۱۵، قیمت عہ

یہ کتاب عرصے سے سامنے ہی میز پر پڑی ہوئی ہے۔ جلد نہایت خوبصورت، کتابت و طباعت نہایت دیدہ زیب کاغذ نہایت عمدہ اور کلام جوش ملیح آبادی کا۔ ان میں سے ہر چیز نے بارہا نگاہ کو دعوت نظر دی لیکن [illegible] اور الاصلاح کے خشک طالب العلمانہ مباحث کبھی اتنی فرصت ہی نہیں دیتے کہ گھڑی دو گھڑی ان سے بھی جی بہلا۔ آج بہت دنوں کے بعد اسے اسکو اٹھایا ہے کہ یہ کیفیت کسی نہ کسی طرح پوری ہو۔ ورنہ تو ترتیب تقریظ و تبصرہ کی حقدار یہی کتاب تھی ایسی حالت میں اگر آپ کی قدر دانی کا صحیح حق ادا نہ ہو سکے تو کارکنان مکتبہ جامعہ کی کریم النفسی سے امیدوار ہیں کہ معاف کر دیں گے۔

جوش صاحب کی شاعری کی یہ خصوصیت ہم کو نہایت پسند ہے کہ وہ ان کے دل کی واردات و تاثرات کی صحیح ترجمان ہے اور ان کی طبیعت ان کی عمر کے ساتھ ساتھ چلتی ہے، وہ ان شاعروں میں نہیں ہیں جو خود تو بوڑھے ہوں مگر ان کی شاعری جوان ہو یا خود جوان ہوں مگر ان کی شاعری کے چہرہ پر جھریاں پڑ گئی ہوں، جوش کے چہرہ پر کبھی اس قسم کی بناوٹی شکن نظر نہیں آتی۔ ایک سچے شاعر کی طرح (حالانکہ شاعر اکثر جھوٹے ہوتے ہیں) ان کے دل پر جو کیفیات طاری ہوئیں موزوں لفظوں کے قالب میں ڈھل گئیں۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ سوسائٹی پر، اخلاق پر، مذہب پر یا دنیا کی روایات پر ان کا کیا اثر پڑے گا۔ جوش اپنے دل کے ترجمان ہیں، دوسروں کے دل کے ترجمان نہیں ہیں، بس وہ شعر کہتے ہیں، سوسائٹی خفا ہوتی ہے خفا ہو جائے، نظام اخلاق درہم برہم ہوتا ہے درہم برہم ہو جائے۔

پریشاں لٹ کرتے ہیں انہیں مطلب ہے شوخی سے

بکھرتا ہے اگر شیرازۂ عالم بکھر جائے

جوش صاحب کے کلام کے تین مجموعے ہماری نظر سے گزرے ہیں، ایک بہت عرصہ ہوا اور وہی غالباً ان کا

پہلا مجموعہ تھا، دوسرا سرسری طور پر، ایک دوست کے ہاتھ میں دیکھا تھا، اور وہ انکی "شبابیات" کا مجموعہ تھا، اور تیسرا یہ جو اس وقت پیش نظر ہے۔ ان تینوں میں سے چند ہی چند نظمیں ہم نے پڑھی ہیں لیکن ہم اعتراف کریں گے کہ جوش قدم بقدم اپنی طبیعت اور عمر کے ساتھ چلتے ہیں۔ چنانچہ جو توقعات اس سے پہلے جوش صاحب کی سرمستیاں دیکھ کر بہت بڑھتا ہوئے ہوں گے وہ اس مجموعہ کو دیکھ کر نہایت حیرت کریں گے کہ اب شاعر کے محسوسات کی دنیا بالکل بدل چکی ہے۔ جوانی کی وہ سرمستیاں اور بیباکیاں جو ان کے کلام کی خصوصیت تھیں اس مجموعہ میں بالکل نظر نہیں آتیں۔ وہ کالی گھٹائیں برس کر کھل گئیں اور عمر کی ترقی کے ساتھ ساتھ شاعر کی طبیعت نے بالکل دوسرا چولا بدل لیا۔ جوش اب رندی و ہوسناکی کے میکدہ سے نکلکر معرفت کے حریم قدس میں قدم رکھ رہے ہیں اور ان دونوں کے بیچ میں جو عالم برزخ ہے اس وقت اس کی کشمکش سے دوچار ہیں۔ کہتے ہیں۔

عقل حیراں ہے ہو تو کیوں کر ہو، شرح اسرار بن نہیں پڑتا،
جانتا ہوں کہ کچھ نہ کچھ ہے ضرور پھر بھی اظہار بن نہیں پڑتا۔

دل کو اقرار ہی نہ ملے
اور انکار بن نہیں پڑتا،

افسوس ہے ان صفحات میں کلام کی مثالیں پیش کرنیکی گنجائش نہیں ورنہ "پر اسرار صدا" اور "ناقابل فہم"، اور "کون ہے"، وغیرہ عنوانات سے انھوں نے جو کچھ کہا ہے سننے کے قابل ہے۔

جوش کی شاعری کی ایک خاص خصوصیت یہ تھی کہ وہ امنگ اور حوصلہ سے معمور تھی لیکن اس مجموعہ کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ نے شاعر کے دل کو بالکل توڑ دیا ہے، اب یا تو کوئی ولولہ انگیز منظر اسے نظر ہی نہیں آتا، یا اتفاقاً آتا ہے تو نگاہ غم آشنا اس میں بھی کوئی نہ کوئی پہلو درد و غم کا ڈھونڈھ لیتی ہے۔ ہر چند وہ اپنی "دیدہ دری" سے مایوسی کی تاریکی میں بھی امید کی جھلک دیکھ لیتے ہیں، لیکن اس مجموعہ میں اس طرح کی جو نظمیں ہیں ان میں وہ زور نہیں ہے جو شاعر کے کلام کی خصوصیت ہے۔ معلوم ہوتا ہے جوش گری ہوئی طبیعت کو زبردستی سہارا دے رہے ہیں اور وہ سہارا

مالکت نہیں۔

جوش زندگی کے ہر شعبہ میں انقلاب کے داعی ہیں لیکن اس مجموعہ کی دو نظمیں۔ جو انھوں نے "خاتون مشرق" او "خاتون مغرب" کے عنوانوں سے لکھی ہیں، ان کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یا تو ان کے اس عموم میں بعض مستثنیات تھے، یا اب شاعر کی نگاہ اس قدر گہری ہوتی جا رہی ہو کہ ہمارے تو دہ خس و خاشاک کے اندر بھی اسے بعض جواہر ریزے مل جاتے ہیں۔ اس نظم کے چند شعر تو سن ہی لیجئے۔

عورتیں اقوام عالم کی بھٹک جائیں گی جب
تو رہے گی بن کے اس طوفاں میں اک نجم طرب

حسن ہو جائیگا جب اڑنے کا وقف خاص و عام
دیدنی ہوگا ترے خلوتکدے کا اہتمام

عالم نسواں پہ کالی رات جب چھا جائے گی
یہ ترے ماتھے کی بیندی صبح کو شرمائیگی

عورتیں تھرکیں گی جب سٹیج پر با رقص و چنگ
اپنی آنکھوں کی لگاوٹ اپنے رخسار دنکا رنگ

انکے آگے ہر نیا میدان ہوگا جلوہ گاہ
اور ترا اسٹیج ہوگا صرف شوہر کی نگاہ

گودیاں پھیلا کے جب مانگیں گی با صدق و صفا
عورتیں اولاد کے پیدا نہ ہونے کی دعا

مژدہ باد اے ایشیا کی دخت پاکیزہ ترا
آنچ آئیگی نہ تیرے مادرانہ ذوق پر

آگے چلکر فرماتے ہیں۔

اے شعاع ارض مشرق! تیری عفت کا شعلہ
کج کریگا ملک و ملت کی کلاہ افتخار

آبرو ہوگا گھرانے بھر کی تیرا رکھ رکھاؤ
دیگا تیرا باپ شایان فخر سے مونچھوں پہ تاؤ

تیری آنکھوں کی کرن سے لے جہان اعتبار
جگمگائیگی نسب ناموں کی لوح زرنگار

بوالہوس کا سر جھکا دیگی تری ادنیٰ جھلک
ہوگی لہجے میں ترے نبض طہارت کی دھمک

تیری پیشانی پہ جھلکے گا شان برق طور
طفل کا ناز شرارت اور شوہر کا غرور

تصویر کا دوسرا رخ "خاتون مغرب" بھی دیکھنے کے قابل ہے۔

جوش غریب مولویوں کو اس مجموعہ میں بھی نہیں بھولے ہیں۔ خانقاہ پر جو کچھ لکھا ہے خوب ہے۔ زبان کے اعتبار سے بھی یہ مجموعہ قابل قدر ہے۔ جوش رنگین اور پرشکوہ ترکیبوں کے ایسے خوگر ہیں کہ عموماً سیدھے سادے خیالات کے لئے بھی ایسا پیرایہ بیان اختیار کرلیتے ہیں کہ آدمی ڈرجاتا ہے کہ کوئی بہت بھاری بات کہیں گے، حالانکہ بات کچھ نہیں ہوتی مگر اس مجموعہ میں بعض نظمیں نہایت سادہ و شیریں زبان میں ہیں۔ الفاظ کے انتخاب میں جوش بہت احتیاط کے عادی نہیں ہیں۔ کہتے ہیں۔

ہندوستاں غلام ہے، گونگا ہے، سرد ہے ہندوستاں میں آپ سخنداں ہوئے تو کیا

یہاں غزلخواں اور سخنور وغیرہ کا ہم معنی کوئی لفظ ہونا تھا۔

کیا بنات بہشت کی تخئیل دل کو کرتی ہے سنگ میں تبدیل

یہاں تخئیل کا لفظ بالکل بے موقع ہے۔

وہ حلق جس کی گرج میں تھا شور باد سموم نفس کی آمد و شد سے بھی آج ہے محروم

رخ پہ جالی تھی غنم نے واں کا ڈھی اس طرف تھی گھنی ہوئی داڑھی،

سن مری بات، میرا کہنا مان یا غفورالرحیم یا رحمٰن

ان شعروں میں خط کشیدہ الفاظ قابل غور ہیں۔ یہ سرسری نگاہ میں بعض چیزیں سامنے آگئی ہیں، ہمارا خیال ہے کہ غور سے پورے مجموعہ کا جائزہ لیا جائے تو اس طرح کے اسقام بہت ہیں۔ بعض اشعار پر مطلق نظر ثانی نہیں ہوئی ہے۔ مثلاً

جس کا دل ہو در حقیقت وہ رصدگاہ عظیم جو ہو فطرت کی ہر ایک کروٹ کا ہمراز و ندیم

کون رصدگاہ عظیم؟ جوش صاحب نے اس کی تشریح نہیں فرمائی۔ ممکن ہے چھاپہ کی غلطی ہو۔
یہاں تک لکھ چکے تھے کہ دفعتہً ہماری نظر اس نظم پر پڑ گئی جس میں جوش نے نقاد کو مخاطب کیا ہے۔

اور اس کو پڑھکر ہم نے محسوس کیا کہ اگر تنقید کیلئے یہ سب شرائط ہیں تو انصاف یہ ہے کہ ہم کو جوش کا کلام پڑھنے کا بھی حق نہیں ہے اس پر لکھنے کا حق تو درکنار۔

ایک عنوان ہے "موسیقی کا جزیرہ" اس کے نیچے جوش نے جو شعر لکھے ہیں ان کو پڑھئے اور داد دیجئے، جو شاعر ایسے اشعار لکھ سکتا ہے اس کے کلام پر اس طرح کی خردہ گیریاں جائز بھی نہیں۔

کانپتی ہیں انگلیاں مطرب کی جب مستانہ وار — راگنی کے آنچ سے جب نرم ہو جاتے ہیں تار

عشق کا جب نبض آہن میں چلتا ہے لہو — حسن کے سانچے میں جب ڈھلتی ہے دل کی آرزو

نغمۂ شیریں سے جب گرتا ہے رنگیں آبشار — دل کو چھو لیتی ہے اک موہوم سی باریک ہوا

زلف کھاتی ہیں جب موج ہوا کی پیچ و تاب — خود سے اٹھ جاتی ہے جب سامنے ماضی کی نقاب

دن ہی رہتا ہے نظر کے سامنے باقی نہ رات — ساز کے پردوں میں چھپ جاتی ہے ساری کائنات

دے میں لہروں کی طرح جس وقت لہراتا ہے دل — ایک جنوں پرور جزیرے میں پہنچ جاتا ہے دل

روح ہوتی ہے جہاں اس گم شدہ شے کی جویا — جس کے کھو جانے سے میری زندگی تھی سوگوار

پھر بھی پانے کی طرح اس چیز کو پاتا نہیں
شکل سی پہچانتا ہوں نام یاد آتا نہیں۔

۶۴

تفسیر سورۂ تحریم:- یہ کتاب نہایت اہم مباحث پر مشتمل ہے اس میں مصنفؒ نے ازواج مطہرات نبوت کے متعلق تمام الزامات کی بدلائل تردید کی ہے، شان نزول کے متعلق نہایت اہم اصولی بحثیں ہیں۔ قیمت ۴ر

تفسیر سورۂ المرسلات:- اس میں سورہ کی ترجیعات اور قرآن کی تمام ترجیعات کے متعلق نہایت اہم نکتے بیان کئے گئے ہیں۔ ہواؤں کے تصرفات سے معاد پر استدلال کے چند نئے پہلو نہایت دقیق ہیں۔ قیمت ۴ر

تفسیر سورۂ عبس:- اس میں انبیاء کے خلق عظیم انکی عصمت اور ان کے مواقع عتاب کے متعلق نہایت اہم مباحث ہیں۔ قیمت ۴ر

تفسیر سورۂ الشمس:- شمس، قمر وغیرہ سے قرآن کے عام اسلوب استدلال کی توضیح کی گئی ہے۔ سورہ کے غیبی اشارات اور ان کے وقوع کی تفصیلات دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ [illegible] عقبہ کی تفسیر خاص توجہ کے لائق ہے۔ قیمت ۴ر

تفسیر سورۂ والتین:- اس میں تین، زیتون، طور سینین اور بلد امین سے وجوہ استشہاد اور ان کی تحقیق کے متعلق مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ تحقیق اور وسعت نظر کا اعجاز ہے۔ قیمت ۴ر

تفسیر سورۂ الکوثر:- کوثر کی حقیقت کے متعلق اس قدر دلائل لکھے گئے ہیں کہ بحث کا کوئی گوشہ محجوب نہیں رہ گیا ہے۔ نماز اور قربانی کی حقیقت اور ان کے باہمی تعلق کی تفصیل جو دلیل اور نہایت ایمان افروز ہے۔ قیمت ۴ر

تفسیر سورۂ الکافرون: اسمیں بعثت کی غایت اور ہجرت کے نتائج کے متعلق ایسے نکتے بیان ہوئے ہیں جنکا سمجھنا قرآن کے بعض نہایت اہم حصوں کے سمجھنے کیلئے نہایت ضروری ہے۔ قیمت ۴ر

تفسیر سورۂ الفیل:- اس کا اردو ترجمہ الاصلاح میں شائع ہو چکا ہے جس سے اسکی اہمیت کا اندازہ ہو سکے گا۔ قیمت ۸ر

تفسیر سورۂ لہب:- اسمیں عام خیال کی مدلل تردید کی گئی ہے کہ یہ سورہ بددعا ہے۔ ابولہب اور اس کی بیوی کے وجوہ ذکر نہایت [illegible] انگیز ہیں۔ قیمت عربی ۴ر - اردو ۲ر

الرأی الصحیح فی من ہو الذبیح:- اس میں اہل کتاب کے دعوی کے خلاف قرآن اور تورات کے محکم دلائل سے حضرت اسماعیلؑ کا ذبیح ہونا ثابت کیا ہے۔ قیمت ۱۰ر

امعان فی اقسام القرآن:- اسمیں ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن کی قسمیں استدلال اور شہادت کیلئے ہیں۔ قیمت ۸ر

تفسیر سورۂ اخلاص:- سورہ اخلاص کی تفسیر اردو زبان میں ہے۔ قیمت ۵ر

اسباق النحو حصہ اول و دوم:- اردو زبان میں عربی صرف و نحو کے بہترین رسالے۔ قیمت حصہ اول ۴ر حصہ دوم ۶ر

دیوان حمید ۶ر - خرد نامہ ۸ر - تحفۃ الاعراب ۳ر

رجسٹرڈ نمبر ایل ۲۹۰۲

جانشین نمبر (دہلی)

دائرہ حمیدیہ کی اعانت

دائرہ حمیدیہ کی خدمت و اعانت کتاب الٰہی کی خدمت و اعانت ہے۔ اس کی اعانت کی تین صورتیں ہیں:-

۱۔ جو حضرات سو روپے یکمشت دائرہ کو عنایت فرمائیں گے وہ دائرہ کے معاون و امی تصور ہوں گے۔ ان کو دائرہ کا رسالہ "الاصلاح" اور تمام مطبوعات برابر ہدیۃً دی جائیں گی۔

۲۔ جو حضرات پچاس روپیہ یکمشت عنایت فرمائیں گے۔ ان کو رسالہ الاصلاح اور دائرہ کی دوسری مطبوعات برابر نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

۳۔ جو حضرات دس روپئے سالانہ عنایت فرمائیں گے ان کی خدمت میں الاصلاح ہدیۃً جاری کیا جائے گا اور سال بھر کی مطبوعات بلاقیمت بھیجی جائیں گی۔

ہدایات و قواعد

۱۔ الاصلاح ہر انگریزی مہینہ کی پندرہ تک شائع ہوگا۔

۲۔ اگر مہینہ کے آخر تک پرچہ نہ پہنچے، فوراً دفتر کو مطلع کیجئے ورنہ قیمت بھیجا جائے گا۔

۳۔ مضامین وغیرہ اڈیٹر کے نام بھیجئے اور دفتر سے متعلق امور کے لئے تمام خط و کتابت منیجر سے کیجئے۔

۴۔ دفتر سے خط و کتابت کرنے میں خریداروں کو نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہئے۔

۵۔ چندہ سالانہ چار روپئے۔ بیرون ہند کے لئے پانچ روپئے۔ فی پرچہ چھ آنے

عبدالاحد اصلاحی منیجر دائرہ حمیدیہ مدرستہ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ

عبدالاحد طابع و ناشر نے اسلامی پریس مدرستہ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ میں چھاپ کر شائع کیا۔

الاصلاح

دائرہ حمیدیہ کا ماہوار علمی و مذہبی رسالہ

مرتبہ

امین احسن اصلاحی

تصنیفات استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

تفسیر نظام القرآن

جن کو اللہ تعالیٰ نے کتابِ الٰہی کے سمجھنے کا صحیح ذوق بخشا ہے۔ ان کا اتفاق ہے کہ سو وقت تک حضرت استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی کی تفسیر نظام القرآن سے بڑھکر کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی۔ اس تفسیر نے قرآن کی تمام مشکلات حل کر دی ہیں۔ استاذ امام کا طریقۂ تفسیر یہ ہے کہ پہلے سورہ کا عمود یعنی عنوان بحث بتلاتے ہیں۔ پھر آیات کا باہمی نظم اور سابق و لاحق سے سورہ کا تعلق واضح کرتے ہیں۔ اس کے بعد سورہ کے تمام مشکل الفاظ اور مشکل اسالیب کو ایک ایک کرکے لیتے ہیں اور کلام عرب کی روشنی میں ان کو بے نقاب کرتے ہیں۔ پھر سورہ کے فلسفہ و اسرار اور غوامض و حکم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور صحیح نقل و صحیح عقل کی روشنی میں عجائب قرآن اور حکم کتاب الٰہی کو اس طرح کھولتے ہیں کہ منکر سے منکر بھی قرآن کی بے پایاں عظمت کے سامنے سر جھکا دیتا ہے۔ اس عظیم الشان تفسیر کے مندرجہ ذیل اجزا چھپ چکے ہیں۔ اہل علم ان کی قدر کریں تاکہ بقیہ کی طبع و اشاعت کا سامان ہو۔

تفسیر سورۃ الذاریات:- اس کتاب میں مولانا کی عام خصوصیات تفسیر کے علاوہ چند باتیں مخصوص اہمیت رکھتی ہیں۔ اس میں مصنف نے اپنے نظریہ کے مطابق ابتدائی قسموں کا عمود سورہ (دینونت) سے تعلق نہایت وضاحت کے ساتھ دکھلایا ہے۔ اسی ضمن میں تمام اہم معذبہ مذکورہ قرآن کے اسباب ہلاکت کی تفصیل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقوام معذبہ کی ہلاکت میں ہوا کے تصرفات کو کتنا دخل رہا ہے بنی اسرائیل کے حضرت موسیٰ کے وقت موقع جواز طرائق عبور کی عظیم الشان تحقیق بھی اس ضمن میں آگئی ہے۔ "خلق تے معا اور خلق زوجین" سے معاد اور رسالت پر استدلال کے جو پہلو بیان ہوئے ہیں انکی قدر صرف اہل ذوق کر سکتے ہیں۔

قیمت:- ۶ر (باقی سرورق صفحہ ۳ پر ملاحظہ ہو)

[illegible] (دہلی)

جلد ۲ | ماہ شعبان المعظم سنہ ۱۳۵۶ھ مطابق ماہ نومبر سنہ ۱۹۳۷ء | نمبر ۱۱

فہرست مضامین

شذرات

مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کی اصلی راہ تو یہ تھی کہ کوئی مرد کار اٹھتا اور وہ اپنی مجددانہ دعوت اور پیغمبرانہ عزیمت سے ہمارے مردہ دلوں کو زندہ کر دیتا۔ ہمارے عقائد کی تمام خرابیاں مٹا دیتا، ہمارے اعمال کی تمام آلودگیاں دھو دیتا، یہاں تک کہ وہ قوم جو آج ہزاروں فرقوں میں بٹ چکی ہے ایک جسم کے اعضاء و جوارح کی طرح جڑ جاتی۔ جو آج ہزاروں سمتوں اور ہزاروں راہوں میں بھاگ رہی ہے۔ صرف ایک ہی صراط مستقیم پر گامزن ہو جاتی۔ جس نے آج نا گفتنی اصنام تراش لئے ہیں سب کو توڑ کر بس ایک ہی حی و قیوم کے سامنے جھک جاتی، جو آج لاتعداد قانونوں اور آئینوں کی محکوم ہے وہ صرف ایک ہی ملکوتی اسوہ کی متبع ہو جاتی، جس پر آج جمود و تعطل کی موت طاری ہے اس میں ایک حساس اور فعال روح دوڑ جاتی، اور پھر وہ طوفان بنکر نہیں بلکہ رحمت کا ابر کرم بنکر اٹھتی اور عالم کے گوشہ گوشہ پر چھا جاتی اور تمام دنیا نیکی اور عدل سے بھر جاتی۔ نہ کمیونزم باقی رہتی نہ سوشلزم، نہ فیشزم باقی رہتی نہ ہٹلرزم۔ اس کا بے پناہ سیلاب دنیا کے سارے فتنوں کو بہا لیجاتا۔ تمام طاغوتی طاقتوں کو توڑ کر رکھ دیتا۔ اور خدا کی زمین میں صرف خدا کا قانون حق و عدل نافذ ہو جاتا۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ

کتنی اچھی آرزوئیں ہیں !

اے دل من چہ آرزوئے خوش است !

اے کاش یہ پوری ہو جائیں! پوری نہ ہو جائیں ان کے آثار ہی نظر آئیں، آثار بھی نہ سہی اس کے امکان ہی کی کوئی تجلی ہم ذرا دیکھ لیں۔ پھر ہم اپنے زبان و قلم کی پوری طاقت سے اپنی قوم کو دعوت دیں گے کہ

جس گوشہ سے یہ کرنیں نمودار ہوں بس اس سمت کو دوڑ کھڑی ہو اور جو فئتہ صالحہ ان پاک اور بلند مقاصد کے لئے اپنا سفر شروع کرے، خواہ اس کی تعداد کتنی ہی قلیل ہو، اس کا سروسامان کتنا ہی کم ہو۔ اور اس کی منزل کتنی ہی کٹھن ہو لیکن اسی کا ساتھ دے۔ اس آسمان کے نیچے حق صرف اسی جماعت کے ساتھ ہے اور بالآخر یہی جماعت غالب اور فتحمند ہوگی۔ اَلَاۤ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

لیکن یہ جماعت کہاں ہے؟ دنیا کے کس گوشہ میں ہم اس کو ڈھونڈنے جائیں؟ ہم اس جماعت کے عشق و طلب میں تڑپ رہے ہیں، تم ہمارا ہاتھ پکڑ کر اس تک پہنچا دو، ممکن ہے تم کہو، یہ جماعت ابھی موجود نہیں ہے، بنائی چاہیے۔ لیکن یاد رکھو، اس طرح کی جماعتیں بنائی نہیں جاتیں۔ خدا کی طرف سے مبعوث ہوتی ہیں۔ اور یہ اسی وقت ہوتا ہے جب خدا کسی قوم پر مخصوص مہر و نوازش فرمائے۔ ہم اتنا تو ضرور کرسکتے ہیں کہ اپنے گھروں کو مٹی کے چراغوں یا بجلی کے قمقموں سے روشن کرلیں۔ لیکن ان کو جگمگا دینے کے لئے آفتاب یا ماہتاب نہیں نکال دے سکتے۔ مشرق سے سورج کو لانا اور شب کی تاریکیوں کو چاند کی ضیا پاشیوں سے کافور کر دینا تو بس تنہا، اسی کے بس کا معاملہ ہے جو سورج اور چاند کا خالق ہے۔ اور یہ بھی یاد رکھو کہ اس جماعت کو بنانے کے لئے دوسروں کو مشورے نہیں دیئے جاتے یعنی اگر آپ نے اخباروں یا رسالوں میں مضامین لکھ دیئے کہ صحابہ کے انداز کی ایک جماعت بنانی چاہیئے۔ تو یہ نہ سمجھئے کہ آپ نے کوئی تیر مار دیا، اس آرزو سے کسی مسلمان کا دل بھی خالی نہیں ہے۔ اس راہ کی اصلی مشکل یہ نہیں ہے کہ یہ نکتہ سمجھانے والے موجود نہیں ہیں۔ اس کو تو سب ہی جانتے ہیں اور سب ہی یہ چاہتے ہیں لیکن چاہنے اور ہونے میں بڑا فرق ہے۔ جو لوگ آج دوسری راہوں پر لگ لئے ہیں ان کو سمجھ لیجئے کہ وہ اس دشوار گذار منزل کی ہمت شکن مصیبتوں کے لئے اپنے کو اہل نہیں سمجھتے۔ اب اگر آپ میں ہمت ہے تو یہ نہ کہیئے کہ یہ ہونا چاہیئے۔ بس اس راہ پر چل کھڑے ہوجایئے اگر آپ سچے ہیں اور عزم راسخ رکھتے ہیں تو بغیر کسی دعوت و تبلیغ کے تمام دنیا کے دل آپ کی طرح کھنچ جائیں گے، اور اگر محض باتیں بنانی ہے تو باتیں بنانے کے لئے یہ عنوان برا نہیں۔ آخر آدمی باتیں بنائے تو اچھی ہی باتیں کیوں نہ بنائے!!

ظاہر ہے کہ جو لوگ معاملہ کو اس نظر سے دیکھ رہے ہوں۔ ان کے سامنے مسلم لیگ اور کانگریس کا نام بھی نہیں آنا چاہیے۔ ان دونوں اداروں میں سے کسی ادارہ کو بھی ہمارے ان مقاصد سے کوئی ادنیٰ شائبہ تعلق بھی نہیں جنکی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ لیکن یہ دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ جو لوگ صحابہ جیسی مقدس جماعت کے سراغ میں نکلے تھے اور جنکی نگاہ کی انتہائی پیمائی اور مقصد کی بلندی کا یہ عالم تھا کہ سد۔ وطنی سے نیچے کی بات بھی نہیں کرتے تھے، دفعتہً مسلم لیگ کو پاکر اسطرح خوشی سے بے قابو ہوگئے ہیں کہ گویا خیر القرون کے غزاۃ و مجاہدین کا کوئی مقدس قافلہ اس بیسویں صدی میں لکھنؤ سے گذر رہا تھا اور ہمارے یہ مقدس متلاشیان حق کہیں اس سے دوچار ہو گئے ہیں۔ بس اب مگن ہیں کہ یوسف گم گشتہ مل گیا اور سمجھتے ہیں کہ جو مسلمان ان کی ومدار سے محروم رہا وہ دین و دنیا کی تمام سعادتوں سے محروم رہا۔ اب نجات کی راہ صرف ایک ہی ہے کہ ہر آدمی مسلم لیگ کا کلمہ پڑھے اسی سے مسلمانوں کے تمام اعمال و عقائد اور تمام احوال و معاملات درست ہو جائینگے۔ انکی سوئی ہوئی قسمت جاگ جائے گی۔ اور مدینہ، دمشق، بغداد، سمرقند، دہلی اور مصر و اندلس کے جو افسانے آج ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں ان کو اپنی آنکھوں سے لکھنؤ میں دیکھیں گے! اور اس نئے اسلامی مرکز خلافت کے امیر المومنین۔ ہماری دینی کشتی کے ناخدا مسٹر محمد علی جناح ہوں گے

در نہ دستی این کوتہ آستیناں بیں!

لکھنؤ میں جو جلسہ ہوا اس پر بعض لوگوں کو نہ صرف اعتماد بلکہ بڑا ناز ہے۔ لیگ مسلمانوں کے پولیٹیکل ادارہ کی حیثیت سے تو بہت دنوں سے معروف ہے لیکن لکھنؤ کے جلسہ کے بعد سے مسلمانوں کی مذہبی رہنمائی کا حق بھی اب اسی کو حاصل ہو گیا ہے۔ اب صرف اسی کو حق ہے کہ تمام شرعی معاملات پر حکم لگائے اور لوگوں کے کفر و ایمان کا فیصلہ کرے، اس نے مسلمانوں کے دوسرے مذہبی اداروں کو حق نمایندگی سے محروم کر کے سب کی ذمہ داریاں تنہا اختیار کر لی ہیں۔ اب وہ صرف مسلم لیگ نہیں ہے۔ بلکہ "مقدس مسلم لیگ" ہے۔ جن طالبہ نے رومن امپائر کی تاریخ پڑھی ہوگی وہ جانتے ہیں کہ ایک زمانہ میں رومن امپائر نے اپنا نام ہولی رومن امپائر (مقدس رومن شاہنشاہی) اختیار کر لیا تھا۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ اب جبکہ لیگ نے ازراہ نوازش ہماری دینی پیشوائی کی ذمہ داریاں بھی سنبھال لی ہیں تو اپنے نام کے آگے ہولی (مقدس) کا لفظ بھی بڑھالے تاکہ اسکے نام ہی سے واضح

ہوگیا کہ وہ مسلمانوں کی جامع الشروط خلافت مقدسہ ہے۔ بجنور میں ہم لیگ کے مجاہدین و غزاۃ اور اس کے مفتیوں کے کارنامے دیکھکر
نہایت محظوظ ہوئے۔ الحمد للہ فتویٰ دینے میں سب ماہر ہیں۔ یہ لوگ اپنے ووٹروں کو نجات کا پروانہ راہداری (Indulgence)
بھی بانٹتے ہیں، گو اس کیلئے سب سے زیادہ موزوں شخصیت تو مسلمانوں کے ایک ہی پیشوائے دینی جناب آغا خان بالقابہ کی ہوتی لیکن
بیچارے کو تو یورپ کی فتوحات سے فرصت نہیں۔ تاہم جو لوگ اس خدمت کو انجام دے رہے ہیں، پوری قابلیت کیساتھ
انجام دے رہے ہیں۔ ایک زعیم ملت کی نگرانی میں محکمہ احتساب (Inquisition) بھی قائم ہے اور جبکہ مجروح
سینے، زخمی سر، اور بیجان لاشیں بھی شفاخانوں میں تڑپ رہی ہیں تو کون انکار کر سکتا ہے کہ تاریخ نے تیرہویں اور چودھویں
صدی میں جو سبق یورپ میں پڑھے تھے، ان کو اس بیسویں صدی میں ہندوستان میں نہیں دہرا رہی ہے!

لیکن "ہولی رومن امپائر" پر جو تبصرہ ڈیٹر نے کیا تھا، وہی تبصرہ ہمارا "مقدس مسلم لیگ" پر ہے۔ اس نے کہا تھا "نہ
یہ مقدس ہے، نہ رومن ہے، نہ شہنشاہی ہے"۔ ہم کہتے ہیں کہ نہ تو یہ 'مقدس ہے'، نہ 'مسلم' ہے، نہ 'لیگ' ہے۔ یہ عافیت پسندوں، خوشامدیوں
خوش خوراکوں، نوابوں، سروں، راجاؤں کی ایک تفریح ہے۔ یہ جو آج اس میں کسی قدر ہماہمی نظر آتی ہے تو اسکا
باعث محض یہ ہے کہ کانگریس کے اقتدار نے سرمایہ داروں اور دولتمندوں کو بدحواس کر دیا ہے۔ اب وہ کچھ چیخنا چلانا چاہتے ہیں
لیکن انکا چیخنا چلانا بالکل ویسا ہی ہے جیسے چوروں کی کوئی جماعت کوتوال کو دیکھکر 'چور' 'چور' چلانے لگے کہ وہ خود چور
سمجھکر نہ پکڑی جائے۔ یہی حرکت لیگ والے بھی کر رہے ہیں۔ "کسان" "مزدور" "انصاف" "مذہب" وغیرہ جیسے عجیب و
غریب الفاظ آج ان حلقوں سے نکل رہے ہیں جو کبھی خدا و انصاف کے نام سے آشنا نہ ہوئیں جنھوں نے اپنے نفس اور انگریزی
گورنمنٹ کی غلامی اور انگریزی کلچر اور تمدن کی مشاطگی کے سوا کوئی کام بھی بھلے آدمیوں کا نہیں کیا۔ یہ حضرات تڑپ رہے ہیں کہ
مذہب خطرہ میں ہے، بیقرار ہیں کہ اسلامی کلچر تباہ ہو رہا ہے، غمگین ہیں کہ اردو کی جگہ ہندی لے رہی ہے، دردمند ہیں کہ عربی زبان
تمام ہندوستان کی زبان کیوں نہیں ہے، اندوہگین ہیں کہ تمام مسلمان ہندو ہو رہے ہیں، متاسف ہیں کہ محمود، شہاب الدین غوری،
بابر اور اکبر و عالمگیر کے بعد اب مسلم لیگ کی حکومت کیوں نہیں قائم ہے؟ اور ان لوگوں کے نزدیک ان تمام جرائم کے ذمہ دار

مولانا حسین احمد، ارکان جمعیۃ علمائے ہند، اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد ہیں! ایک دن وہ بھی تھا جب ہمارے ریفارمر علماء چلاتے تھے کہ مسلمان مغربی تہذیب و تمدن، و عیسائیت کے سیلاب میں بہے جا رہے ہیں، تو یہی تھے جو عیسائیت اور فرنگیت کے علمبردار تھے اور مولویوں کی چیخ پکار پر غصہ سے اپنے سر نوچتے تھے کہ یہ دیوانے مسلمانوں کو ترقی کی جنت سے روکتے ہیں۔ لیکن اب یہی ہیں جو اسلامی کلچر اور اسلامی روایات و تمدن کے لئے اگلے زمانہ کے مسلمانوں سے زیادہ سرگرم ہیں۔ لیکن ہم ان حماۃ دین سے صرف اتنا پوچھتے ہیں کہ کل جب آپ عیسائی ہونے سے نہیں شرمائے، مسلمانوں کی فرنگیت مآبی پر نہیں آزردہ ہوئے، عربی تمدن، عربی علوم اور قرآن کی تباہی میں ان کے شریک رہے تو آج ہندو ہونے سے اسقدر شرم کیوں ہے؟ کفر و شرک ہونے میں تو دونوں برابر ہیں، کیا محض اسلئے کہ عیسائی ہونے میں صرف خدا کی ناخوشی تھی لیکن یہ دنیاوی آقا خوش تھے۔ اور ہندو ہونے سے ڈاؤننگ اسٹریٹ کے صنم اکبر کا قہر و غضب ظاہر ہوتا ہے!!

لوگوں کو بڑا ناز ہے کہ لیگ نے لکھنؤ میں وہ تجویزیں پاس کر دی ہیں کہ جنکے بعد اب کانگریس بھی اسکے سامنے گرد ہے۔ اب وہ مکمل آزادی بھی چاہتی ہے اور مزدوروں اور کسانوں کی ہمدرد بھی ہے اور سب سے بڑھکر یہ کہ وہ اقلیتوں کے حقوق کی ہندوستان میں تنہا محافظ جماعت ہے۔ وہ ایک طرف انگریزی گورنمنٹ سے غزوہ کریگی کہ وہ مکمل آزادی دیکر ہندوستان سے رخصت ہو جائے، دوسری طرف ہندوؤں سے جہاد کریگی کہ وہ تمام اقلیتوں کے حقوق پہلے سے بانٹ دیں۔ تیسری طرف ایک خانقاہ تعمیر کریگی جسمیں ہندوستان کے ۸ کروڑ مسلمانوں کو جمع کر کے ان کو ارباب صفہ کی طرح دینی تعلیم و تربیت کا ایک کامل نمونہ بنا دیگی۔ معلوم نہیں ہم جیسے بدقسمت لوگ، لیگ کی ان پیغمبرانہ کارفرمائیوں کو دیکھنے کیلئے زندہ رہیں گے یا نہیں۔ کیسے مبارک وہ دن ہوں گے! اور کیسا مسعود زمانہ ہو گا! حضرت مسیح نے "آسمان کی بادشاہت" کے نام سے شاید اسی دور کی بشارت دی تھی!! پھر یہ کتنی عجیب بات ہو گی کہ یہ سب کارنامے حسین احمد، ابوالکلام، کفایت اللہ، احمد سعید نہیں انجام دیں گے۔ یہ تو سب ہندوؤں کے غلام ہیں، کافر و بیدین ہو گئے ہیں! اس کیلئے مسٹر جناح، فضل حق، سر سکندر، راجہ محمود آباد جیسے مجدد دین ملت اور مصلحین امت میدان میں آئیں گے!۔

لیکن ہمنے لیگ کا چہرہ غور سے دیکھا، جھریاں صاف نمایاں ہیں، البتہ اس نے پوڈر ضرور مل لیا ہے اور یہ پوڈر غالباً اسی آنند بھون سے چرایا گیا ہے جس کے حریفانہ حملوں نے لیگ کو ان نئے عزائم سے مسلح ہونے پر مجبور کیا ہے۔ ہاں اتنی بات نئی ہے کہ اب سینہ پر صلیب کے نشان کے بجائے بغل میں تسبیح و سجادہ ہے۔ وہی تسبیح و سجادہ جو کل تک دقیانوسیت کی یادگار تھا۔ جو مسلمانوں کی بربادی کا تنہا باعث تھا لیکن آج لیگ

بہت مجبوب ہے کچھ آپ سمجھ ان چیزوں کی لیگ کو کیوں ضرورت پیش آئی؟ کامل آزادی کا پودا اسلئے ملا گیا ہی کہ بغیر اسکے نوجوانوں کو شکار کرنا ناممکن تھا۔ اور تسبیح و سجادہ بغل میں اسلئے ہی کہ بغیر اسکے الکشن جیتنا ناممکن ۔ پھر اسیقدر نہیں اب فیس بھی صرف وہی آٹھ آنہ ہی یعنی کانگریس سے بھی کم۔ غور کرو اس ارزانی کے ساتھ ساتھ جب لیگ کی دلربائیوں اور ہوش فگنیوں کا یہ عالم ہوگا تو کون ہے جو اپنے صبر و تقویٰ کو سلامت بچا کے لیجا سکے گا۔

الوداع اے صبر و تقویٰ الوداع اے ہوش و دیں!

گویا آجتک لیگ پر صرف یہ الزام تھا کہ اسکا نصب العین بلند نہیں ہی۔ لیکن جبکہ اس نے اپنا نصب العین اونچا سے اونچا قرار دے دیا تو کوئی وجہ نہیں کہ اب تمام مسلمان اسکے اسلامی جھنڈے کے نیچے جمع نہ ہو جائیں۔ بلا شبہ لیگ کا نصب العین اب بہت بلند ہو گیا ہی لیکن خدارا یہ بھی ارشاد ہو کہ کیا لیگ والوں کا نصب العین بھی بلند ہو گیا ہی۔ کاغذ و نپر تو سیاہ سیاہ نقوش بہت سے ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہم نے دیکھے۔ لیکن دلونمیں بھی جرأت حق کی کوئی کرن اتری ہی؟ زبانونکی روانی اور تقریرونکی بے پناہی تو اللہ اکبر! طوفان ہے طوفان! پنجاب سے لیکر بنگال تک سب دہل گئے! لیکن اب دیکھنا یہ ہی کہ ہاتھونکی چابکدستی اور پاؤنکی پھرتی اور چستی کا کیا حال ہوتا ہی۔ انکی جہانگیری صرف کھانے کی میزوں اور اسمبلی کی گیلریوں ہی تک ہے، یا کچھ ان سے آگے بھی۔ سنتے ہیں مسٹر جناح کی خدمت میں تلوار پیش کی گئی، اور انھوں نے وہ تلوار بڑی خوشی سے قبول فرمالی، بعض بزرگوں کا ادب مانع ہی ورنہ حضرت سعدی کا ایک مصرع بالکل زبان ہی پر ہے۔ لیکن کچھ سنا آپنے؟ اس تلوار کو پاکر آپ کیا کریں گے؟ مصطفےٰ کمال بنیں گے، ہاں مصطفےٰ کمال: وہی "بے دین" ترک جس نے ٹرکی میں اسلامی خلافت، اسلامی تمدن، عربی زبان، عربی مدارس، عربی دین، عربی علما سب کو پیس کے پامال کر دیا۔ آپ بھی مصطفےٰ کمال بنیں گے۔ اور ہندوستان میں ہمارے ان دوستونکی آرزوئیں پوری کرینگے جھنوں نے پہلی صدی ہجری کے بعد سے یہ قسم کھا کے آنکھیں بند کرلی تھیں کہ جبتک دنیا میں ایمان و صداقت کی بہار پھر نہ لوٹے گی اسوقت تک آنکھیں نہ کھولیں گے۔ اب وہ آنکھیں کھولیں کہ وہ دور میمون آگیا۔ اور وہ موید بروح القدس پیدا ہو گیا جو دنیا کو پھر ایمان اور نیکی سے بھر دے گا!

مبارک تھے وہ جو بھوکے رہے کیونکہ اب انکی آسودگی کا وقت آگیا ہی!!

مسلم (بانکی پور پٹنہ) نہایت عمدہ اخبار ہے۔ اس کا مسلک نہایت مستقیم ہے۔ ادھر چند مہینوں سے اس نے نہایت حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ سیاسی بلندی کے ساتھ ساتھ اب اس میں کافی ...... ادبی خوبصورتی پیدا ہوگئی ہے اور ہم کو یقین ہے کہ اسکے کارکنوں نے اگر استقلال و پامردی اور ایثار و سرگرمی کیساتھ کام کو جاری رکھا تو انشاءاللہ یہ اخبار نہ صرف بہار بلکہ پورے ہندوستان کے اردو اخبارات میں نہایت بلند جگہ حاصل کرے گا۔

بہار کے بعض ملقوں میں اسکی مخالفت کیجا رہی ہے اور شاید کچھ لوگ اسکو بائیکاٹ بھی کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک امر لائق اعتنا نہیں۔ اگر مسلم کے کارکنوں نے اسکو اہمیت دی یا اس سے بددل یا ہراساں ہوئے تو انکو اخبار نویسی کا مشغلہ ترک کرکے کوئی اور دھندا اختیار کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ پہلی منزل ہی اسی خار زار سے شروع ہوتی ہے اور جس اخبار یا رسالہ کو یہ افتاد نہ پیش آئے سمجھ لو کہ وہ اخبار نہیں محض کاغذ کا پرزہ ہے۔ بس حق و صداقت کو اپنے پیش نظر رکھو، خدا مدد کرے گا۔

اس سے کوئی یہ مطلب نہ سمجھے کہ ہمیں مسلم کی ہر بات سے اتفاق ہے۔ ہمیں اسکی بہت سی باتوں سے اختلاف بھی ہوتا ہے۔ بعض مرتبہ اسکی غیر معتدل نکتہ چینیوں اور بدگمانیوں سے ہم کو بڑی تکلیف ہوتی ہے اور ہماری بڑی خواہش ہے کہ کسی اخبار میں یہ بات نہ ہو لیکن اس وبائے عام میں کون مبتلا نہیں !!

بہرحال اس ابتلا میں ہمارا ناچیز مشورہ تو بس یہ ہے کہ

اذا ہم القی بین عینیہ عزمہ   ونکب عن ذکر العواقب جانبا

تفسیر سورۃ الفیل اردو نومبر کے اخیر تک شائع ہو جائیگی اور وسط دسمبر تک انشاءاللہ تفسیر سورۃ الکافرون اور سورۃ العصر کے ترجمے بھی چھپ جائیں گے تفسیر سورۃ الفیل ۱۱۳ صفحات میں آئی ہے اور قیمت ۸؍ ہے۔ الکافرون اور والعصر کی قیمتوں کا اعلان انشاءاللہ دسمبر کے پرچہ میں ہو سکے گا۔ منیجر

معارف قرآن

تفسیر سورۂ عبس

(۳)

تالیف استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ

ترجمہ امین احسن اصلاحی

ان آیات کا باہمی نظم اور پیش و عقب سے تعلق

۹۔ پہلے یہ بیان کیا کہ قرآن مجید نہایت بلند و برتر کتاب اور ارواح خبیثہ کی دسترس سے بالکل محفوظ ہے۔ اس کے بعد اس نعمت عظمیٰ سے انسان کی بے پروائی کی شناعت کو واضح کرنے کے لئے اپنی قدرت کاملہ کے پہلو بہ پہلو انسان کے عجز و درماندگی کا حال بیان کیا تاکہ کمال فضل و احسان کے آئینہ میں انسان اچھی طرح دیکھ لے کہ باہمہ ضعف و عجز اس کی بدبختیوں اور ناسپاسیوں کا کیا عالم ہے۔

اور چونکہ اسلوب بیان مقتضی تھا کہ انسان ایمان و اطاعت کی راہ اختیار کرے اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کا شکر گذار ہو اس لئے اس کے بعد فرمایا [ما اکفرہ] انسان کتنا ناشکرا ہے! یعنی ان تمام افضال و عنایات کے باوجود اس کی ناسپاسیوں اور کفر و عصیان کا معاملہ کتنا عجیب ہے!

[من نطفۃ] سے لیکر [فاقبرہ] تک غور کرو تو معلوم ہوگا کہ قرآن نے ان چند لفظوں کے اندر انسانی زندگی کے تینوں مرحلے:۔ اول، وسط، آخر، پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دیئے ہیں۔

پہلا مرحلہ یہ ہے کہ انسان اس تھوڑے سے پانی سے پیدا ہوا، جو خدائے حکیم و قدیر کی حکمت و قدرت سے تمام جسم کے اطراف سے چھن چھن کے جمع ہوا۔ اس کے بعد اس پر اللہ تعالیٰ کے تمام تصرفات جاری ہوئے۔ یہ تمام تفصیل جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، لفظ "نطفة" سے سمجھی جاتی ہے۔

مرحلہ وسطی یہ ہے کہ انسان اپنے ارادہ و فعل کے تمام گوشوں میں جو کچھ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی توفیق و تیسیر سے کرتا ہے، بغیر اس کے اس کو کسی چیز پر بھی کوئی قدرت حاصل نہیں ہے۔

آخری مرحلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو مارتا ہے اور قبر میں رکھواتا ہے۔ اس سے انسان کی کمال بے بسی اور عجز و درماندگی کی حالت ظاہر ہوتی ہے وہ یکسر اپنے پروردگار کے قبضہ و تصرف میں ہے۔

ان حالات کے بعد، جو خدا کی قدرت اور پروردگاری پر مختلف جہت سے دلیل ہیں، یہ بات آپ سے آپ واضح ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ انسان کو اس کے اعمال کا بدلہ دینے کے لئے ایک دن اٹھائے گا کیونکہ جو انسان مخلوق و مصنوع ہے اور زندگی و معیشت کے تمام گوشوں میں خدا کی بخشی ہوئی توفیق کی رہنمائی رکھتا ہے، عبث نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ ضروری ہے کہ اس کے لئے پرسش اور جزائے اعمال کا بھی ایک دن ظاہر میں آئے۔

اب پورے سلسلہ پر غور کرو کہ انسان اپنے آغاز کے روز اول سے لیکر اپنے اٹھائے جانے کے دن تک کس طرح عاجز و درماندہ ہے۔ اور تمام حالات کس طرح اس کی بے بسی پر دلیل ہیں؟ پھر اس کے باوجود بھی اگر وہ اپنے رب سے بے نیاز ہو جائے اور اس نعمت سے منہ پھیرلے جو اس زندگی میں اس کیلئے توفیق و رہنمائی کی سب سے بڑی روشنی ہے تو اس کی محرومیوں کا کیا حال ہوگا!

اِن دلائل کے ذکر کے بعد کلام ان دلائل کی طرف متوجہ ہو گیا ہے جو انسان اپنے گرد و پیش دیکھتا ہے اور جن سے نہایت واضح طور پر ثابت ہے کہ وہ خدا کا مخلوق بندہ ہے اور اسی کی بخشی ہوئی روزی سے پلتا ہے۔ اور ان کے ذکر کا منشا محض یہ ہے کہ انسان کی نافرمانی اور ناشکری

کی شناعت پوری طرح واضح ہو جائے ۔ فرمایا :-

كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَا أَمَرَهُ (۲۳) فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ (۲۴) أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا (۲۵) ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا (۲۶) فَأَنبَتْنَا فِيهَا حَبًّا (۲۷) وَعِنَبًا وَقَضْبًا (۲۸) وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا (۲۹) وَحَدَائِقَ غُلْبًا (۳۰) وَفَاكِهَةً وَأَبًّا (۳۱) مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ (۳۲)

ہرگز اس نے پورا نہ کیا جو اس نے فرمایا (۲۳) انسان اپنی غذا پر نگاہ کرے (۲۴) ہم نے پانی کو گرایا (۲۵) پھر زمین کو پھاڑا (۲۶) پھر اس میں اگائے اناج (۲۷) اور انگور اور ساگ (۲۸) اور زیتون اور کھجور (۲۹) اور گھنے باغ (۳۰) اور میوے اور دوب (۳۱) تمھارے اور تمھارے مویشیوں کے برتنے کے لئے (۳۲)

الفاظ کی تفسیر اور جملوں کی تاویل

(از آیت ۲۳ تا ۳۲)

[کلا] انسان کی بے پروائی اور نافرمانی پر زجر و تنبیہ ہے۔ بعد کے الفاظ سے اسکی تشریح ہو جاتی ہے۔

[لما یقض] یعنی اپنی نافرمانی کی حالت پر برابر قایم ہے۔

[ما امر] یہ فطرت کے الہام اور وحی و تنزیل دونوں کو عام ہے۔ خدا نے انسان کی فطرت میں شکر گذاری اور ہمدردی خلق کا جو جذبہ الہام فرمایا ہے اور انبیاء کے واسطے سے جو اوامر و نواہی بھیجے ہیں سب اس کے تحت میں آجائیں گے۔

[انا] یہ اور اس کے بعد کے جملے طعام سے بدل کے محل میں واقع ہیں یعنی انسان ان تمام چیزوں پر نگاہ کرے

[صبینا الماء صبا] بہت زیادہ پانی بہایا۔ دوسری جگہ فرمایا ہے وانزلنا من المعصرات ماء ثجاجا

[وشققنا الارض شقا] شق کا لفظ زمین کے لئے مختلف اعتبارات سے استعمال کیا گیا۔ (۱) جب بارش ہوتی ہے زمین کے مسامات اس کو پی لینے کے لئے کھل جاتے ہیں (۲) زمین کو پھاڑ کر اللہ تعالےٰ نے اس میں نہریں اور ندیاں جاری کیں۔ چنانچہ عربی میں بحر اور نہر کے الفاظ بھی اسی پر دلالت کرتے ہیں۔ نہرہ کے معنی ہیں فتقہ (اسی) طرح بحرہ کے معنی ہیں شقہ (۳) نباتات زمین کے نیچے سے ابھرتی ہیں اور اوپر سے سطح پھٹ جاتی ہے اور پھر طرح طرح کی سبزیاں اور اناج اگتے ہیں (۴) کسان بونے سے پہلے ہل کے ذریعہ زمین کو پھاڑتا ہے۔

یہاں یہ تمام مفہوم لگتے ہوئے ہیں اس لئے ایک ایسا جامع لفظ استعمال فرمایا جو تمام مفہوموں پر حاوی ہوگیا۔

[قضبا] وہ نباتات جو بالکل تروتازہ حالت میں کھائی جائے۔ قضب کے معنی کاٹنے کے ہیں۔ یہ مفہوم لفظ قضب کے آہنگ سے کس قدر مناسب ہے۔ مضغ کے اندر بھی یہ مناسبت موجود ہے۔ یہ لفظ نہایت جامع ہے اس میں وہ تمام چیزیں آجائیں گی جو تازہ اور شاداب حالت میں کھائی جاتی ہیں۔

[حدائق] جمع ہے حدیقہ کی۔ حدیقہ کے معنی ہیں گھرا ہوا باغ، اشجار پر بھی اسکا اطلاق ہوتا ہے۔

[غلبا] اغلب کی جمع ہے۔ اغلب موٹی گردن والے کو کہتے ہیں۔ حدائق کے لئے غلب کی صفت دو پہلوؤں سے آسکتی ہے۔ یا تو حدائق کو جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں، اشجار کے معنی میں لیا جائے۔ یا یہ کہ جیسا کہ معروف اسلوب ہے، شی کی صفت اس کے متعلق کی صفت سے بیان کی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک پہلا زیادہ واضح ہے۔ کیونکہ اس سلسلہ میں جسقدر چیزیں بیان ہیں سب نباتات کی قسم کی ہیں۔ پس مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں حدایق سے اشجار مراد لئے جائیں۔ پھر فعل بھی انبتنا استعمال ہوا ہے

جو انجار کے معنی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

۱ [اَبًّا] ' ابّ ' تر و تازہ اور شاداب گھاس۔ یہ اب یوب ابا و اباتہ سے ہے جس کے معنی ظاہر ہونے اور نمودار ہونے کے ہیں۔ یہ قدیم مادہ ہے جس پر بعض لسانی تصرفات ہو جانے کی وجہ سے بعض حالتوں میں اس کی شکل بدل گئی ہے۔ اور عربی زبان میں یہ تصرفات بہت عام ہیں۔ مثلاً ام وہم، ہبّ و تا ہب۔ پس اب درحقیقت ہبّ کی ایک شکل ہے۔ عربی میں اس طرح کے تصرف کی مثالیں بہت ملتی ہیں۔ مثلاً ہترّ و اتّر وراق و ہراق۔ اعشیٰ کا مصرعہ ہے ع اخ قد طوی کشحا و اب لیذہبا اب یعنی اٹھا اور ارادہ کیا۔ شاداب گھاس کو اب اس لئے کہتے ہیں کہ بارش کے بعد یہ سب سے پہلے نمودار ہوتی ہے۔ اسی سے ابان النبات کا لفظ پیدا ہو گیا۔ پھر کسی قدر توسیع کر کے ابان الشباب بھی بولنے لگے۔ آہستہ آہستہ ہر چیز کے اول وقت کیلئے استعمال ہونے لگا۔

جوہری وغیرہ کا خیال ہے کہ ابان مادہ ابن سے بروزن فعال مبالغہ کا صیغہ ہے۔ حالانکہ ان دونوں میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ ابنہ بشئی کے معنی ہیں اس کو کسی بات کی تہمت لگائی۔ یہ ابنۃ سے ہے جو اس گرہ کے لئے بولا جاتا ہے جو لکڑی میں ہوتی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ اب سے فعلان کا صیغہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان نہایت گہری معنوی مناسبت موجود ہے۔ یہ مادہ عبرانی زبان میں بعینہٖ اسی معنی میں پایا جاتا ہے۔ אבב (اب ب) אב (اِب) ترکاری اور پھل אביב (ابیب) سبزبالی اور یہودیوں کے پہلے مہینہ ربیع کے لئے مستعمل ہے اس لئے کہ وہ نباتات کی روئیدگی اور نمو کا اولین مہینہ ہے۔ اس تفصیل سے یہ امر واضح ہو گیا کہ یہ مادہ عربی زبان میں مستعمل ہے لیکن اشعار میں اس کا استعمال کم ہوا اس کی وجہ یہ ہے کہ لغت میں اس کے نہایت ہلکے مترادفات موجود تھے۔ لیکن جہاں ایک جامع لفظ کا استعمال ناگزیر اور حسن موقع مقتضی ہوا یہ لفظ استعمال کیا گیا۔ یہاں مختلف وجوہ مقتضی تھے کہ یہی لفظ استعمال کیا جائے۔ اگلی فصل میں اس کی تفصیل آئیگی۔ پس یہ بات

کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما اس لفظ سے ناواقف تھے۔ اس روایت کا پہلا حصہ منقطع ہے اور دوسرا حصہ مضطرب۔ اور وجوہ ذیل اس بات پر نہایت واضح دلیل ہیں کہ یہ بالکل ضعیف ہے۔

۱۔ یہ سورہ مکی ہے۔ مکی زندگی میں صحابہ کا اصلی مشغلہ قرآن مجید کا پڑھنا پڑھانا تھا۔ اگر یہ لفظ ان کو معلوم نہ تھا تو اس قدر طویل صحبت کے باوجود انھوں نے اس کو آنحضرت صلعم سے کیوں نہیں دریافت کیا۔ اور آنحضرت صلعم نے ان کو کیوں نہیں بتایا؟ کیا صحابہؓ قرآن مجید سے بالکل غافل تھے کہ جب آنحضرت صلعم کی وفات ہو چکی تو انھیں معلوم ہوا کہ یہ لفظ بغیر تحقیق کے رہ گیا۔ اور اس وقت ان کو اس کے عدم علم کا اعتراف کرنا پڑا!

۲۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زبان نہایت واضح اور سہل ہے۔ اشعار اور خطبات کی جو عام زبان تھی اسی زبان میں نازل ہوا۔ پھر عکاظ میں شعراء کے جو کلام پیش ہوتے ان کے حسن و قبح کا فیصلہ قریش ہی کرتے۔ حضرت ابوبکرؓ کا شمار عرب کے مشہور سرداروں اور خطیبوں میں تھا اور حضرت عمرؓ تو گویا قریش کی زبان اور ان کے ترجمان تھے۔ کلام پر ان کی تنقیدیں معلوم ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان کے معاملہ میں ان کا رتبہ کس قدر بلند تھا۔ پھر حیرت ہے کہ یہ ماہرین ادب و لغت قرآن مجید کے ایک لفظ سے بالکل بے خبر رہ گئے۔

۳۔ قرآن مجید عرب کی نہایت معروف اور کھلی ہوئی زبان میں اترا تاکہ لوگوں کو اس کے ذریعہ دین کی دعوت دی جائے اور لوگ اس کی تعلیمات کو سمجھیں۔ اس بات کو خود قرآن مجید نے مختلف موقعوں پر مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔ مثلاً فرمایا: وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ ہم نے نہیں بھیجا کسی رسول کو مگر اس کی قوم کی زبان کے ساتھ۔ ایک دوسری جگہ فرمایا:۔ انا جعلناہ قرآنا عربیا لعلکم تعقلون۔ ہم نے اس کو بنایا عربی قرآن تاکہ تم اس کو سمجھو۔ پس یہ کیسے ممکن ہے کہ قرآن مجید

ایسے لفظ استعمال کرے جن کے معانی پر بڑے بڑے صحابہ نہ مطلع ہوسکیں؟ یہ بات تو اس کے عربی مبین ہونے کے صریح منافی ہوگی:

۴۔ جن لوگوں نے یہ روایت گڑھی ہے انھوں نے اس کو اکابر صحابہؓ کی طرف منسوب کردیا ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ جو لوگ صحابہ پر طعن کے شایق تھے وہ بیشتر بڑے صحابہؓ ہی کو تاکتے تھے۔

[متاعًا] متاع اصل میں مصدر ہے۔ پھر یہ بطور اسم ہر اس چیز پر استعمال ہونے لگا جو برتی جائے۔ یہیں سے ساز و سامان اور سرمایہ کے لئے بولا جانے لگا۔ اس لفظ کے اندر قلت مدت کا مفہوم بھی چھپا ہوا ہے۔ کبھی تو یہ مفہوم تصریح کے ساتھ ظاہر کردیا جاتا ہے اور کبھی اس میں مقدر ہونے کی وجہ سے نہیں ظاہر کیا جاتا۔ یہ بات قرآن مجید کے استعمالات سے بالکل واضح ہے۔ متاع فی الدنیا ثم الینا مرجعھم یعنی تھوڑے دنوں کے لئے دنیا کی زندگی میں برتنا ہے، پھر ہمارے پاس لوٹائے جائیں گے پس یہاں 'متاعا لکم' میں دو صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ اس کو مصدر مانا جائے جیسا کہ یمتعکم متاعا حسنا الی اجل مسمیٰ میں ہم پاتے ہیں۔ اس شکل میں تاویل یہ ہوگی کہ یہ چیزیں ہم نے اس لئے پیدا کی ہیں کہ تم کو ان سے بہرہ مند کریں، دوسری شکل یہ ہے کہ اس کو حال مانا جائے۔ یعنی درانحالیکہ یہ چیزیں تمھارے برتنے کیلئے ہیں۔ لیکن باعتبار نتیجہ دونوں تاویلیں یکساں ہی ہیں..... البتہ پہلی صورت میں اللہ تعالیٰ کی پروردگاری اور انعام کا پہلو زیادہ نمایاں ہوگا کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارادہ بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ اس نے یہ سب کچھ انسان کو بہرہ مند کرنے کے لئے بنایا ہے۔

اشیائے مذکورہ میں باہمی ترتیب و مناسبت

(۱) اس سورہ سے پہلے کی تین سورتوں میں، اِن آیات کی مثالیں تھیں مل سکتی ہیں، اُن پر ایک نگاہ ڈال لو۔ یہ چاروں سورتیں اپنے مضامین کے اعتبار سے نہایت ملتی جلتی ہوئی ہیں، صرف

اسلوب اور نہج کا فرق ہے۔ موقع کی رعایت سے ایجاز تفصیل اور ترتیب کے ڈھنگ بدل گئے ہیں۔ اصل حقیقت ہر جگہ ایک ہی ہے۔ اس سورہ میں اقتضائے مقام سے جو ترتیب ملحوظ ہے چند لفظوں میں ہم اس کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

یہاں جیسا کہ واضح ہوگا الاقدم فالاقدم کا اصول اختیار کیا گیا یعنی ضرورت کے اعتبار سے جو شے جسقدر زیادہ نمایاں اور اہم تھی ترتیب میں اس کو اسی قدر اہم اور نمایاں جگہ ملی اور ایجاز و اختصار کی انتہائی رعایت کے ساتھ تفصیل اور استقصاء کا اسلوب ملحوظ رکھا گیا چنانچہ پہلے ان چیزوں کا ذکر کیا جو سیرابی کی زیادہ محتاج ہیں اور جن سے انسان کو جلد رزق حاصل ہوتا ہے اگر بارش بکثرت نہ ہو تو یہ چیزیں وجود میں نہ آسکیں اور ان سے انسان محروم ہوجائے حالانکہ انسان کی معیشت کا دارومدار زیادہ تر انہی چیزوں پر ہے۔ یہ چیزیں تین قسم کی ہیں۔ غلہ، پھل، سبزیاں اور ترکاریاں۔ پس ان میں سے سب سے پہلے اناج کا ذکر کیا۔ یہ انسان کے سامان معیشت کا سب سے زیادہ جامع عنصر اور ذخیرہ کی چیزوں میں سب سے اہم ہے۔ پھر انگور کا ذکر کیا جو راس الاثمار ہے۔ نیز ذبیب کی صورت میں ذخیرہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور نبیذ کی صورت میں ایک صالح اور طیب شراب ہے۔ عرب ان اشیاء کی اس قدرتی ترتیب سے واقف تھے۔ اعشیٰ قیس کا شعر ہے۔

فاروی الزروع واعنابها علی سعة ماءها قسم

اس شعر میں اناج کے بعد اس نے انگور کا ذکر کیا ہے۔ اس لئے کہ معیشت کی ضروری چیزوں میں جو جذبہ اہتمام وہ ان چیزوں کے لئے اپنے اندر رکھتے تھے وہ دوسری چیزوں کے لئے نہیں رکھتے تھے۔

اس کے بعد قضب کا ذکر کیا۔ یہ ان تمام چیزوں کے لئے ایک جامع اسم ہے جو تر و تازہ اور کچی حالت میں کھائی جائیں۔ قرآن مجید میں قریب قریب یہی ترتیب بعض اور مقامات میں بھی ملحوظ ہے مثلاً فرمایا:- لنخرج بہ حبا ونباتا تاکہ ہم اس کے ذریعہ اگائیں اناج اور نباتات۔ قضب پر ان چیزوں کا

بیان ختم ہو جاتا ہے جو جلد نفع پہنچانیوالی اور زیادہ سیرابی و آبپاشی کی محتاج ہیں۔ اس کے بعد دوسری چیزوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو اولاً تو دیر پھل لاتی ہیں ثانیاً سیرابی اور آبپاشی کی کچھ ایسی محتاج نہیں ہوتیں۔ عموماً صرف آسمان کی بارش ان کے لئے کفایت کر جاتی ہے۔ مثلاً عام درخت۔ ان میں زیتون کو سب سے مقدم رکھا۔ اولاً تو اس کے مبارک اور مقدس ہونے کی وجہ سے ثانیاً اسکی بعض دوسری خصوصیات کیوجہ سے جنکا ذکر ہم آگے کریں گے۔ اس کے بعد نخل یعنی کھجور کا ذکر فرمایا۔ یہ اہل عرب کے لئے اپنے اندر غذا اور لذت دونوں کا ذخیرہ رکھتی ہے۔ یہ ان کے لئے اناج بھی ہے اور انگور بھی۔ پھر اسی سلسلہ میں تمام پھل والے بڑی قسم کے درختوں کا ذکر کر کے اس دوسری نوع کی چیزوں کا بیان ختم کر دیا۔

جس ترتیب کے ساتھ ان چیزوں کا بیان قرآن مجید میں آیا ہے۔ بالکل اسی ترتیب کے ساتھ توراۃ میں بھی آیا ہے۔ اس میں بھی زمین کی اہم پیداواروں کا جہاں ذکر ہوا ہے۔ اناج، انگور، زیتون کا بیان اسی ترتیب سے ملتا ہے۔ (دیکھو تثنیہ باب ۲۴: ۱۹-۲۱ و باب ۲۸: ۳۸-۴۰) البتہ کھجور کا ذکر چھوڑ دیا ہے۔ اس لئے کہ شام کھجور کی پیداوار کے لئے کوئی اچھی جگہ نہیں ہے۔ یہ عرب کی مخصوص چیز ہے۔ بلکہ کہنا چاہئے کہ ان کے ملک کی اصلی پیداوار یہی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جگہ جگہ اس کا ذکر اناج کے ساتھ ملتا ہے۔ مثلاً فرمایا۔ فی جنت وعیون وزروع ونخل طلعہا ھضیم دوسری جگہ فرمایا۔ ونزلنا من السماء ماء مبرکا فانبتنا بہ جنت وحب الحصید والنخل باسقت لہا طلع نضید۔ ایک جگہ فرمایا۔ وجنت من اعناب وزرع ونخیل۔

غرض ان دونوں میں وہ تمام چیزیں سمٹ گئی ہیں جنکو انسان بوتا اور لگاتا ہے۔ اس کے بعد ایک تیسری جامع نوع کا بیان کیا جس کے دو لفظوں میں زمین کی تمام باقی نباتات آگئیں یعنی فاکہہ اور اب۔ ان میں سے ایک انسان کے لئے ہے، دوسری چوپایوں کے لئے۔ چنانچہ اس کی تصریح بھی فرما دی۔ متاعا لکم ولانعامکم تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے برتنے کے لئے۔ یہ ایک مخصوص اسلوب

جو کسی سلسلہ کے بعد بطور استدراک اس لئے نمایاں ہوتا ہے کہ اس سلسلہ کی بقیہ تمام چیزوں کو سمیٹ کر تکمیل کی مہر لگا دے۔ قرآن مجید میں اس جامع اسلوب کی مثالیں بہت ملتی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا بما تبصرون وما لا تبصرون۔ ایک جگہ بہت سے انبیاء کا نام ذکر کرنے کے بعد فرمایا ورسلاً قد قصصناھم علیک من قبل ورسلاً لم نقصصھم علیک۔ بہت سے انبیاء ہیں جن کے حالات ہم نے تم کو سنا دیئے اور بہت سے ایسے ہیں جن کے حالات ہم نے تم کو نہیں سنائے۔ اسی طرح بہت سے بارکش جانوروں مثلاً گھوڑے، خچر اور گدھے وغیرہ کے ذکر کے بعد فرمایا ویخلق ما لا تعلمون۔ اور بہت سی ایسی چیزیں پیدا کرتا ہے جن کو تم نہیں جانتے۔

آیات کا تعلق آگے اور پیچھے سے

اس تذکیر کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم کو اور ہمارے چارپایوں کو جو روزی مل رہی ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کی بخشی ہوئی ہے۔ پس ہمارا تمام تر انحصار اسی کی ذات پر ہے۔ وہی ہے جس نے حیوانات کو ہمارا محکوم اور خدمت گار بنا دیا ہے اور جس طرح ہم خدا کے بخشے ہوئے رزق سے پلتے ہیں۔ اسی طرح وہ بھی خدا کے خزانہ جود سے روزی پاتے ہیں۔ پس یہ کیسی بدبختی ہے اور شقاوت کی بات ہے کہ ان انعامات و افضال کے باوجود ہم اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے سرتابی کریں۔

اس تعلیم کی نظیر پچھلی سورہ میں گذر چکی ہے۔ اس لئے یہاں ہم اس کا صرف اتنا حصہ بیان کرنا چاہتے ہیں جس سے ان آیات کا تعلق آگے اور پیچھے سے واضح ہو جائے۔ تمام تفصیلات کو دوبارہ دھرانا غیر ضروری ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں ٹکڑوں میں ایک بات بطور قدر مشترک کے موجود ہے۔ یعنی ان میں انسان کی بے پروائی اور اس کے تمرد پر اس کو سرزنش کی گئی ہے لیکن

دونوں میں سرزنش کے پہلو کسی قدر مختلف ہوگئے ہیں۔ پہلے ٹکڑے میں انسان کے کفرو انکار پر سرزنش ہے اور اس دوسرے ٹکڑے میں اسکی نافرمانی اور ناشکری کا پہلو پیش نظر ہے۔ اور ساتھ ہی ان میں اللہ تعالیٰ کی پرزور دلیل قیامت کے دن اٹھائے جانے کی ایسی دلیلیں بھی چھپی ہوئی ہیں جن سے ایمان بالجزاء کی طرف رہبری ہوتی ہے۔

علاوہ بریں ایک اور بھی پہلو پیش نظر رکھو۔ ان آیات میں آسائش و معیشت کے جن سامانوں و نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ دنیا و آخرت کی زندگی کی ایک نہایت جامع مثل ہے۔ اس نکتہ کو سمجھنے کیلئے ذیل کی آیت پر تدبر کرنا چاہئے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلَىٰ أَنفُسِكُم مَّتَاعَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ أَنزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ حَتَّىٰ إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَادِرُونَ عَلَيْهَا أَتَاهَا أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَاهَا حَصِيدًا كَأَن لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ كَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ	اے لوگو، تمھاری سرکشی کا وبال تمھاری ہی جانوں پر آئیگا۔ دنیا کی چند روزہ زندگی کے مزے اڑالو، پھر ہماری طرف تمکو لوٹنا ہے اور ہم تمکو خبردینگے ان چیزوں کی جو تم کرتے رہے ہو۔ دنیا کی زندگی کی مثال تو بس ایسی ہے کہ جسطرح پانی کہ جسکو ہم نے برسایا آسمان سے پس زمین کی نباتات جنکو آدمی اور چوپائے کھاتے ہیں اس میں مل گئیں یہانتک کہ جب زمین نے اپنا سنگھار کرلیا اور وہ خوشنما ہوگئی اور اسکے مالکوں نے سمجھا کہ وہ اب اس پر قادر ہیں آیا ہمارا حکم اس پر رات کے وقت یا دن کے وقت پس ہم نے اس طرح اس کا ستھراؤ کردیا گویا کل وہ کچھ تھی ہی نہیں۔ یونہی ہم اپنی آیتوں کی تفصیل کرتے ہیں سوچنے والوں کے لئے۔

چنانچہ اس مقام کی اسی پوشیدہ حقیقت کے اقتضاء سے اس کے بعد قیامت اور روز جزاء کا بیان شروع ہوگیا۔

ان آیات کے مطالعہ سے یہ امر بھی واضح ہوگیا کہ قرآن مجید میں جو آیتیں ترغیب و ترہیب کے لئے آتی ہیں ان میں بھی استدلال کا زور پوری طرح موجود ہوتا ہے۔ اور یہ قرآن کا نہایت عام اسلوب ہے۔

اس کے بعد فرمایا:۔

(باقی)

قربانی

امین احسن اصلاحی

اس مہینہ میں قربانی پر ایک سلسلۂ مضامین شروع کرنا چاہتا تھا لیکن پے بہ پے اپنی مشغولیتیں پیش آتی گئیں کہ کوئی دو ہفتہ سے ایک دن بھی اطمینان نصیب نہیں ہوا۔ یہ مختصر تحریر پارسال الجمعیۃ دہلی کے ذبیح نمبر کے لئے لکھی تھی، اس مہینہ میں اسی کو پیش کرتا ہوں۔ انشاءاللہ آیندہ اسی عنوان پر یا کسی دوسرے عنوان سے کوئی مفید سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ (اڈیٹر)

کچھ دنوں سے ایک جماعت میں یہ خیال پھیل رہا ہے کہ قربانی کا موجودہ طریقہ بالکل غلط ہے۔ اسلام میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ اسلام نے جس قربانی کا حکم دیا ہے اس کا مقصود محض ایک وقتی ضرورت کو پورا کرنا تھا۔ مکہ ایک بیابان غیر ذی زرع تھا۔ زمانہ حج میں لوگوں کا اژدہام ہوتا تو خوراک کا میسر آنا مشکل ہوتا اس لئے اکثر لوگ خوراک کے لئے جانور اپنے ساتھ لے جاتے اور بوقت ضرورت ان کو ذبح کر کے خود بھی کھاتے اور دوسروں کو بھی کھلاتے۔ بس یہی قربانی کی اصل ہے۔ اسلام نے اس بات کا ہرگز حکم نہیں دیا ہے کہ لاکھوں جانور کاٹ کر منی کے کھڈوں میں بھر دئے جائیں اور ہر شہر اور قصبہ کی گلی گلی خون سے رنگین نظر آئے۔

یہ خیال غالباً سرسید احمد خاں مرحوم کی ادبیات میں سے ہے۔ اگرچہ مشہور ہے کہ اس آسمان کے نیچے کوئی بات نئی نہیں، لیکن جہاں تک ہماری معلومات ہیں، اپنے اس خیال میں وہ بالکل منفرد تھے۔ اگلوں میں سے ایک شخص بھی ان کا ساتھی نہیں ہے۔ اور اس خیال کی لغویت اس قدر واضح تھی کہ گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ آیندہ یہ مقبولیت حاصل کر سکے گا۔ لیکن بالآخر اس آواز نے بھی اپنے

پیچھے ایک گروہ اکٹھا کر ہی لیا۔ اور بدقسمتی سے زمانہ ایسا ہے کہ لوگوں نے کسی بات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے سے یکقلم انکار کر دیا ہے۔

سرسید احمد خاں مرحوم کو جو بات کھٹکی، وہ یہ تھی کہ لاکھوں جانوروں کا قتل عام درانحالیکہ ان سے کسی قسم کا انتفاع ناممکن ہو، ایک فعل عبث ہے۔ اور اس کا انتساب وہ اسلام کی طرف پسند نہیں کرتے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ موجودہ زمانہ میں جو لوگ اس مذہب کی وکالت کر رہے ہیں ان کو بھی یہی بات کھٹک رہی ہے لیکن وہ اپنا مدعا سرسید مرحوم کی طرح صاف صاف لفظوں میں بیان کرتے ہوئے جھجکتے ہیں اور چاہتے ہیں اس کو اپنے اجتہاد و تحقیق کا ایک نیا کارنامہ قرار دے کر ایک نئے آب و رنگ کے ساتھ پیش کریں۔

قربانی کی حقیقت اگر یہی ہے جو اوپر کی سطروں میں ظاہر کی گئی ہے تو ان لوگوں کا خیال قابل غور ہے جو کہتے ہیں کہ اس کو کسی ایسی دوسری شکل میں بدل دینا چاہئے۔ جو مسلمانوں کے لئے زیادہ مفید ہو۔ لیکن قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کی حقیقت صرف اس قدر نہیں ہے بلکہ اس سے بہت زیادہ ہے۔ بلاشبہہ یہ بات بھی قربانی کے فوائد و مصالح میں داخل ہے۔ چنانچہ سورۂ حج کی ایک آیت میں اسکی تصریح ہے۔

وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ	اور چند متعین دنوں میں ان چوپایوں پر جو اللہ
عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ	نے ان کو روزی کئے ہیں اللہ کا نام لیں پس
فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ	اس میں سے کھاؤ اور تنگ حال فقیر کو کھلاؤ

لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قربانی کی حقیقت بس اسی قدر ہے اور یہ مقصد کسی دوسری شکل میں اس سے بہتر طریق پر حاصل کیا جا سکے تو قربانی کو ترک کیا جا سکتا ہے۔

بلاشبہہ امت کی کثرت، وسائل حمل و نقل کی سہولت اور ذرائع ثروت کی فراوانی نے حالات میں بہت کچھ تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں اور اب منیٰ کے میدان میں اتنے جانور ذبح ہونے لگے ہیں جو محتاجوں اور

چیزوں کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ اور مجبوراً زمین میں دفن کردیئے جاتے ہیں۔ لیکن حالات
میں یہ تبدیلیاں حضرت نبی کریم (صلعم) سے راز نہ تھیں۔ آپ تمام عالم کے لئے آخری پیغمبر کی حیثیت سے مبعوث
ہوئے تھے اور ذریت اسمٰعیل کی کثرت کا جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا تھا
وہ آپ کو معلوم تھا اور اس کے علاوہ آپ کی امت کی کثرت کے جو واضح اور مخفی اشارات و اعلانات
قرآن مجید میں فرمائے گئے تھے وہ بھی آپ کے سامنے تھے لیکن اس کے باوجود آپ کے کسی اشارے سے
پتہ نہیں چلتا کہ قربانی کی یہ مصلحت کسی عہد میں منقضی ہو سکتی ہے۔ اور اس کو کسی دوسری صورت
میں بدلا جا سکتا ہے آنحضور صلعم کے بعد خلفائے راشدین کے عہد میں بھی کوئی اس قسم کا اشارہ نہیں
ملتا، حالانکہ اس دور میں کثرت امت کے آثار عملاً پوری طرح نمایاں ہوگئے تھے۔ قربانی تو خیر ایک اصولی
چیز ہے۔ حج کے بعض ضمنی مراسم جن کے متعلق بظاہر گمان ہوتا ہے کہ ان کے مصالح عہد نبوت کے بعد
ختم ہو چکے۔ خلفائے راشدین نے ان میں بھی کسی طرح کی تبدیلی نہ کی۔ ان کو بعینہٖ قائم رکھا کہ دین کی
چھوٹی سے چھوٹی بات بھی اپنے اندر گوناگوں مصالح رکھتی ہیں۔ پس اس کی ایک مصلحت اگر منقضی ہو جائے تو وہ
چیز اعمال دین کی فہرست سے خارج نہیں کر دی جائے گی، قائم رکھی جائے گی کیونکہ اس کے بہت
سے مصالح ابھی قائم ہیں۔ طواف کے مراسم میں رمل و اضطباع اور سعی صفا و مروہ بھی داخل ہیں۔
حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ان کا مقصود مسلمانوں کی قوت و صولت کا اظہار ہے۔ کفار طعنہ دیتے
تھے کہ مسلمانوں کو مدینہ کے بخار نے توڑ دیا۔ اب ان میں دم نہیں رہ گیا۔ اس لئے ضرورتی ہوا کہ مسلمان
ان طریقوں سے اپنے جوش و نشاط کا اظہار کریں۔ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں چاہا کہ رمل و اضطباع
ترک کر دیں کہ جس مقصد کے لئے یہ اختیار کئے گئے تھے وہ مصلحت اب باقی نہیں رہی۔ جن مسلمانوں نے حکومت
کسریٰ کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دی اب وہ اپنی صولت و دبدبہ کے اظہار کے لئے رمل و اضطباع کے محتاج نہیں
ہے لیکن غور کے بعد ان کو نظر آیا کہ ان کا ترک صحیح نہیں ہوگا۔ کیونکہ انکی صرف ایک مصلحت ابھی منقضی

ہوئی ہیں، دوسری بہت سی مصلحتیں ابھی باقی ہونگی، جن کے لئے ان کا قائم رکھنا ضروری ہے۔

غور کیجئے رمل و اضطباع کی حیثیت بالکل ضمنی ہے۔ یہ نہ تو دین کے اصول میں داخل ہیں، نہ حج کے، لیکن حضرت عمرؓ نے ان میں کسی قسم کا تغیر پسند نہ فرمایا۔ پھر اگر ہم قربانی کے متعلق محض اس بنیاد پر کہ ایک ضمنی مصلحت، اور وہ بھی پوری نہیں، صرف ایک حد تک ختم ہو چکی ہے، یہ فتوے دیں کہ اس کو ترک کر دیا جائے یا اس کو کسی دوسری شکل میں تبدیل کر دیا جائے تو کتنی عجیب بات ہوگی۔

قربانی کے متعلق ہر شخص کو یہ بات معلوم ہوگی کہ وہ شعائر اللہ میں داخل ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ	اے ایمان والو اللہ کے شعائر کی بے توقیری
اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ	نہ کرو اور نہ حرمت والے مہینہ کی، نہ قربانی کے
وَلَا الْقَلَائِدَ	جانوروں کی نہ پٹے والے جانوروں کی۔

اہل علم کو معلوم ہے کہ اس میں اجمال کے بعد تفصیل کا اصول ملحوظ ہے۔ پہلے مجملاً فرمایا، شعائر اللہ کی بے توقیری نہ کرو، اس کے بعد شعائر اللہ کے چند اہم اجزا بطور تفصیل بیان فرمائے۔

شعائر اللہ کی حقیقت کیا ہے؟ لغوی تحقیقات میں یہاں پڑنے کی گنجائش نہیں۔ البتہ شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے اس کی جو حقیقت سمجھی ہے اس کو پیش کرتا ہوں۔ وہ معاملہ کی تہ تک بالکل ٹھیک پہنچ گئے ہیں۔ فرماتے ہیں:- ان الطريقة التي نبهها الله تعالى للناس هي محاكاة ما في صقع التجرد باشياء يقرب تناولها للبهيمية واعني بالشعائر اموراً ظاهرة محسوسة جعلت ليعبد الله بها واختصت به۔

یعنی شاہ صاحب کے نزدیک شعیرہ وہ چیز ہے جو کسی مجرد حقیقت کو ہمارے مادی قویٰ کی گرفت میں لانے کے لئے کسی محسوس پیکر میں پیش کرے، پس قربانی ایک ظاہر ہے جس کے اندر ایک اہم حقیقت مخفی ہے، اور وہی حقیقت اصل مقصود ہے، اور چونکہ اس حقیقت کی تمثیل کے لئے یہ پیکر خود خدا نے تراشا ہے اس لئے یہی پیکر بہترین (آئیڈیل) پیکر ہے۔ کسی شخص کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ اس حقیقت کو

منتقل کرنے کے لئے یہ شکل نہیں فلاں شکل موزوں تھی۔ اسلام دنیا کا آخری مذہب یا تمدنی مذہب کی آخری قسط ہے اس لئے اس مذہب کو اپنے ظاہر و باطن دونوں اعتبارات کے ال کی آخری حد پر ہونا چاہیے۔ اگر اس کی کسی چیز میں کسی پہلو سے کوئی نقص رہ گیا تو پھر یہ دنیا کا آخری مذہب نہیں ہوا۔ اگر ہم اس کے کسی جزئیہ کے متعلق یہ خیال رکھتے ہیں کہ اس کو کسی دوسری بہتر صورت میں بدلا جا سکتا ہے تو درپردہ ہم اسلام کے آخری مذہب ہونے کا انکار اور ایک نئے مذہب کی ضرورت کا اقرار کرتے ہیں۔

یہ ایک ضمنی بات تھی، سلسلہ کلام کی بات یہ ہے کہ قربانی ایک شعیرہ ہے یعنی ایک صورت جو ایک حقیقت کو پیش کرنے کے لئے اسلام نے اختیار کی ہے۔ اس لئے یہ خیال کرنا بالکل غلط ہو گا کہ قربانی کا مقصود محض یہ ہے کہ آدمی اس کا گوشت خود کھائے اور غریبوں اور مسکینوں کو کھلائے اگر قربانی مقصود یہی ہے تو قربانی کا ظاہر ہی ہی ذریعہ اسکو شعائر کی فہرست میں گنانے کی کیا ضرورت تھی یہ تو کسی حقیقت کی تمثیل نہیں ہوئی؟

اب سوچنا چاہئے کہ قربانی کس حقیقت کی تمثیل کر رہی ہے۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی حقیقت اسلام کی تصویر ہے۔ اسلام کیا چیز ہے؟ مسلم کی تعریف کیا ہے؟ ان سوالات کے جوابات قربانی کی صورت میں ہماری نگاہوں کے سامنے مشہود کر دیئے گئے ہیں۔ یعنی ہم قربانی کے آئینہ میں ایک مسلم کا اصلی کردار پورا پورا دیکھ سکتے ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ہم نے اسلام کے متعلق کچھ نہ جانا ہو۔ صرف قربانی کے جانور کی گردن پر چھری چلائی ہو تو بس یہی ایک بات اسلام کے سمجھ لینے کے لئے کافی ہو گی۔ کتابوں کے ہزاروں صفحات میں اسلام کا جو فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ قربانی میں وہی فلسفہ ہماری آنکھوں کو دکھا دیا گیا ہے۔

یہ قطعی ہے کہ ہماری قربانی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کی یادگار ہے، قرآن مجید میں اس کی نہایت واضح تصریحات ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے امامت وسیادت کا جو منصب عطا فرمایا وہ بلا سبب نہیں عطا فرمایا بلکہ ان کو نہایت سخت امتحان میں جانچا اور جب وہ اس میں پورے

پورے اترے تو مستحق ٹھہرے کہ قوموں کی سرداری کی عزت پائیں۔

وَاِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا

اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں جانچا اور ابراہیم نے وہ پوری کر دیں تو کہا میں تمکو لوگوں کا امام بنانیوالا ہوں۔

یہ امتحان کس بات کا امتحان تھا؟ کمال اسلام و اطاعت کا۔

وَلَقَدِ اصْطَفَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ۔ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

اور ہم نے اس کو دنیا میں برگزیدہ ٹھہرایا اور آخرت میں وہ صالحین کے زمرہ میں ہوگا۔ یہ اس لئے کہ جب اس سے اسکے پروردگار نے کہا کہ اپنے رب کی اطاعت کیلئے سرفگندہ ہو جاؤ اس نے کہا کہ میں نے اپنے تئیں سارے جہان کے پروردگار کے حوالہ کیا

اس اسلام و اطاعت اور تسلیم و سرفگندی کو انھوں نے کس طرح مشہود کیا؟ کیا محض زبان سے کہدیا کہ "اسلمت لرب العلمین"؟ اگر محض زبان سے کہدینا تھا تو اس امتحان میں تو کوئی مسلمان بھی پیچھے نہ رہے گا۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کیا خصوصیت ہوئی؟ اس کے جواب کے لئے فرمایا۔

فَلَمَّاۤ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ

پس دونوں جب مرضی الٰہی کے سامنے جھک گئے اور ابراہیم نے بیٹے کو ماتھے کے بل پچھاڑ دیا۔

یعنی ابراہیم کا اقرار، اعلان زبان سے نہ تھا بلکہ انھوں نے اپنی اطاعت کاملہ کو عمل میں لاکر دکھا دیا اور وہ اسطرح کہ جو چیز ان کو سب سے زیادہ محبوب تھی یہانتک کہ اپنی جان بھی اتنی عزیز اور محبوب نہ تھی اسکی گردن پر چھری چلانے کے لئے آستینیں چڑھالیں۔ گویا اسلام کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی اپنے کو کلیتہً مولیٰ کے حوالہ کر دے، یہانتک کہ اگر خدا کا حکم ہو تو اپنی عزیز سے عزیز چیز یہ کہتا ہوا اسکی راہ میں قربان کر دے کہ

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔

"وانا من المسلمین" کا اقرار اسی حقیقی معنی کے لحاظ سے ہو۔ اس کے عام معنی میں تو سب شریک ہیں اور اللہ تعالیٰ کو مطلوب حقیقی اسلام ہے۔ جو کامل تسلیم و سرفگندی سے عبارت ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قوموں کی امامت اسی امتحان اسلام میں پورے اترنے کے صلہ میں ملی تھی اور انھوں نے اسلام کی جو حقیقت پیش کی تھی وہ یہ تھی کہ ایک اشارۂ غیبی کی تعمیل میں اپنے لخت جگر کی گردن پر چھری چلانے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ اسی کو اللہ تعالیٰ نے کھلے ہوئے امتحان سے تعبیر فرمایا: "ان هذا لهو البلاء المبین"۔ اور ان کو جو کچھ بخشا اسی کے صلہ میں بخشا۔

اب امت مرحومہ کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے افضال پر غور کرو۔ ہم کو جو دین بخشا اس کا نام اسلام ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے جو لقب دلوایا وہ مسلم ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ذریت میں مبعوث فرمایا جو ذبیح اللہ تھے۔ ان تمام خصوصیات نے جمع ہو کر یہ واضح کر دیا کہ وہ حقیقی اسلام جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس تھا اس کے وارث مسلمان ہوئے۔ پس ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنی عزیز سے عزیز چیز کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کرنے کے لئے ہر آن آمادہ رہے۔

انھیں خصوصیات کی بنا پر اسلام میں قربانی ضروری ہوئی تاکہ مسلمان اپنے ملی نصب العین کو ایک عام اجتماع میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کریں اور ان میں یہ بات تازہ رہے کہ ان کی جان ان کی ملکیت نہیں ہے، خدا کی ملکیت ہے۔ جس طرح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی جان ایک مینڈھے کے عوض چھڑائی گئی تھی اسی طرح انھوں نے بھی اپنی جان ایک چوپایہ کے عوض میں چھڑائی ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ خدا نے ان کی جان ان کو سونپ دی ہے۔ نہیں۔ خدا کے دین کو جب ضرورت ہوگی

ان کا فرض ہوگا کہ اپنی گردنیں کٹوا دینے کے لئے وہ بے جھجک آگے بڑھیں گے کیونکہ یہی وہ حقیقی قربانی ہوگی جسکی محض یادمیں انھوں نے جانوروں کی گردنوں پر چھریاں چلائی ہیں۔

انھی اسباب سے قربانی کیلئے مقام وہی تجویز ہوا جہاں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کا واقعہ پیش آیا تھا۔ اور چونکہ حقیقی قربانی جانوں ہی کی قربانی ہو جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی سے واضح ہو اسلئے ضروری ہوا کہ اسکی محاکات جان کی قربانی کی صورت میں ہو۔ کسی دوسری صورت میں نہ ہو۔ ورنہ اصلی تخیل محفوظ نہ رہ سکے گا۔ چنانچہ قربانی میں دو باتیں ضروری ہوئیں ایک یہ کہ عزیز ہو۔ دوسرے یہ کہ جاندار ہو۔ انسان کی مملوکات میں عزیز چیزیں بہت سی ہوسکتی تھیں لیکن جاندار بجز حیوانات کے کوئی دوسری چیز نہ تھی اس لئے ضروری ہوا کہ حیوانات ہی انسان کے قائم مقام ہو کر خدا کی راہ میں ذبح ہوں اور انسانیت کی ترقی و بہبود کے سب سے بڑے نصب العین کو زندہ رکھیں۔

اس تفصیل سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ قربانی حقیقت اسلام کی تصویر ہے اور چونکہ حقیقت اسلام کو پیش کرنے کیلئے سب سے زیادہ سچا اور مکمل واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ تھا اس لئے وہی واقعہ قربانی میں بطور مثال کے پیش نظر رکھا گیا۔ ظاہر ہو کہ قربانی کا یہ مقصد اس مقصد سے بالکل مختلف ہے جو قربانی کے مخالفین نے سمجھ رکھا ہے۔ وہ قربانی کے فوائد و مصالح میں سے ایک ضمنی بات کو اسکا اصلی مقصد قرار دیکر حیران ہوتے ہیں کہ لاکھوں جانور منیٰ کے میدان میں ذبح کرکے دفن کیوں کر دیئے جاتے ہیں۔

اور ہم نے بالاجمال قربانی کے متعلق جو خیال قرآن کی روشنی میں پیش کیا ہو اس کے لحاظ سے قربانی کو اسلام کے تمام خط و خال کا آئینہ ہونا چاہئے اور ہمارے نزدیک درحقیقت قربانی کی یہی حیثیت ہے لیکن ، جن لوگوں کی نظر ان حقائق تک نہیں پہنچ سکتیں وہ سمجھتے ہیں کہ قربانی محض کھانے کھلانے کیلئے ہے حالانکہ قربانی کے متعلق یہ سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص قرآن مجید کے متعلق یہ کہے کہ اس کا مقصد لوگوں کو وضو کی تعلیم دینا ہے۔ بلاشبہ قرآن مجید وضو کی تعلیم بھی دیتا ہے لیکن یہ کون کہہ سکتا ہے کہ یہی قرآن کا مقصود ہے اور چونکہ اب لوگوں کو وضو کا طریقہ معلوم ہو چکا اسلئے قرآن مجید کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

مذاکرہ

(۲)

لفظ آلاء کی تحقیق

از جناب مولوی بدرالدین صاحب اصلاحی

آلاء کا لفظ قرآن مجید میں چند مقامات پر آیا ہے۔ ایک تو سورۃ الرحمٰن کی ترجیعات میں۔ فبای آلاء ربکما تکذبان (۵۵: ۱۳) دوسرے سورۃ النجم کے آخر میں فبای آلاء ربک تتماری (۵۳: ۵۵) تیسرے سورۃ الاعراف میں دو جگہ فاذکروا آلاء اللہ (۷: ۶۹ و ۷۴)

عام طور پر قرآن مجید کی ہر تفسیر اور ترجمہ میں اس لفظ کے معنی "نعمتوں" کے قرار دئے گئے ہیں، لیکن حقیقت میں اس لفظ کا یہ ترجمہ اصل مفہوم کے اعتبار سے غیر صحیح ہے۔ قرآن مجید کی آیتوں کا سیاق و سباق اور شعراء جاہلیت کے مواقع استعمال دونوں اس مفہوم کے صریح خلاف ہیں۔

آلاء کے اصلی معنی "شئون عجیبہ" کے ہیں یعنی وہ کام اور واقعات جو اپنے اندر کوئی نیرنگی عظمت شان اور اہمیت رکھتے ہوں۔ اس لفظ کے وسیع اور جامع مفہوم کو کسی قدر آسانی کے ساتھ ادا کرنے کے لئے اگر کوئی دوسرا موزوں لفظ ہو سکتا ہے تو وہ فارسی زبان کا لفظ "کرشمہ" ہے جو ہماری بولی میں بھی مستعمل ہے۔

کلام جاہلیت میں اس معنی کی مثالیں بکثرت موجود ہیں، جن کو آگے چلکر ہم پیش کریں گے۔ اس موقع پر سب سے پہلے اس حقیقت کو کھول دینا ضروری معلوم ہوتا ہے، جس کی وجہ سے لوگوں نے لفظ

اصلی معنی کی طرف توجہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کے تمام افعال میں رحمت کا جزو غالب ہے۔ وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں سب کا مبنی رحمت ہی ہوتی ہے اس لئے بعضوں نے الآء کی قریب ترین تعبیر کے لئے نعمت کا لفظ اختیار کر لیا۔ اور چونکہ اسی اعتبار سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ سے بھی اس لفظ کی یہی تعبیر منقول ہوئی۔۔۔۔ اس لئے اور بھی کسی کو لفظ کے اصلی مفہوم کی تحقیق کے لئے مراجعت لغت وکلام عرب کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

قرآن مجید کی جو تاویل صحابہ کرامؓ سے منقول ہے اس کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ وہ صحت وقطعیت میں اپنی نظیر آپ نہیں ہے۔ صحابہ کرام قرآن کی ایک ایک ادا کے واقفکار اور قرآن کے ایک ایک لفظ کے بہترین رمز شناس تھے۔ ان کا مرتبہ "صاحب البیت" کا تھا۔ قرآن کی ہر چیز ان کی اپنی چیز تھی اس لئے اگر کسی آیت یا کسی لفظ کی کوئی تاویل کسی صحابی سے منقول ہو تو وہ تاویل بہرحال بہترین تاویل ہوگی۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ سلف کی تفسیر وتاویل کا ایک خاص انداز ہوتا تھا۔ اگر آپ نے ان کے اس انداز کا صحیح اندازہ نہیں لگایا ہے، تو بہت ممکن ہے کہ بعض باتوں کے سمجھنے میں دھوکا ہو جائے پس سلف کے انداز تفسیر کو نگاہ میں رکھنا ہر طالب قرآن کے لئے بیحد ضروری ہے۔ بے شمار مواقع ہیں جہاں اس راہ کی معمولی لغزش، ناقابل حل مشکلات میں ڈالدیتی ہے۔

سلف کا یہ عام دستور تھا کہ جب ان سے کسی چیز کے متعلق سوال کیا جاتا تو وہ سائل کے سوال کے مطابق جواب دیدیتے۔ اور عموماً مسئول عنہ کی غیر ضروری تحقیق وتفتیش کے بجائے اس کے کسی متبادر اور عام مفہوم یا مراد کی طرف اشارہ کر دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ایک لفظ کے متعلق کتب تفاسیر میں سلف کے متعدد اقوال ملتے ہیں مثلاً دیکھئے "کوثر" کے متعلق مطولات فن میں صحابہ کرام کتنی روایتیں منقول ہیں۔

کسی نے کہا کوثر جنت میں ایک نہر ہے کسی نے کہا کہ کوثر سے مراد خیر کثیر ہے۔ کسی نے کہا کوثر قرآن ہے۔ کسی نے کہا کوثر حکمت اور اسلام ہے۔ کسی نے کہا کوثر سے مراد نبوت ہے۔ اب غور فرمائیے صحابہ کے اس اختلاف تاویل کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے؟ یہ تو کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کوثر کی صحیح تاویل سے بےخبر تھے اور وہ بھی ترجمان القرآن اور حبر الامۃ جیسے صحابہ، اگر وہ بےخبر تھے تو پھر دوسرا کون ہے جو قرآن کے ایک حرف کے متعلق بھی باخبر ہونے کا دعوی کر سکتا ہے؟ یقیناً وہ کوثر کی صحیح تاویل کو جانتے تھے لیکن اسکی تشریح میں ان کے نام سے جو مختلف اقوال ملتے ہیں ان میں سے زیادہ تر اسی اصول کی بنا پر ہیں۔ جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ اس لئے اگر حضرت ابن عباسؓ کی کسی روایت میں آلاء کو نعمتوں کے معنی میں لیا گیا ہے تو یہ لفظ آلاء کی اصلی تحقیق اور اوس کا لغوی مفہوم نہیں ہے بلکہ اس کے ایک مخصوص مراد کی طرف اشارہ ہے جو سائل کے سوال کے مطابق بیان فرمائی گئی ہے۔ اس لئے زبان کے عام استعمال اور لفظ کے واقعی مفہوم کو نظر انداز کر کے صرف اس روایت کی بنا پر لفظ آلاء کے متعلق یہ خیال کر لینا کہ اس کے معنی "نعمت" ہیں کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ لفظوں کی تحقیق کے باب میں اصلی قابل اعتماد چیز لغت اور کلام عرب ہے۔

عربی لٹریچر کے موجودہ سرمایہ میں جہانتک ہماری نگاہ قاصر پہونچ سکی ہے۔ کسی مستند شاعر کا ایک شعر بھی ایسا نہیں مل سکا ہے جس میں آلاء کو نعمتوں کے معنی میں استعمال کیا گیا ہو۔ برخلاف اس کے محیر العقول کارناموں کے لئے حیرت انگیز عادات و خصائل کے لئے اور عجیب و غریب کارسازیوں کیلئے یہ لفظ ایک عام اور روزمرہ لفظ کی طرح ہر جگہ ملتا ہے۔ مثلاً طرفہ کہتا ہے:-

کامل یحمل آلاء الفتی ۔۔۔ نبه سید سادات خضم

میتہ بنت ضرار اپنے بھائی کے مرثیہ میں کہتی ہے:-

کریم ثناه و آلاءه ۔۔۔ وکافی العشیرة ما غالیا

مہلہل عرب کا مشہور شاعر اپنے بھائی کلیب کے مرثیہ میں کہتا ہے:-

الحزم والعزم كانا من طبائعه ما كل آلائه يا قوم احصيها

بنی غیظ بن سید کا ایک مشہور شاعر ربیعہ بن مقروم کہتا ہے :-

ولولا فوارسنا ما دعت بذات السليم تميم تميما

وما ان لأوبثها ان اعد مآثر قومي ولا ان الوما

ولكن اذكر آلاءنا ..... حديثاً وما كان منا قديما

اجدع الهمدانی کا شعر ہے۔ اپنے گھوڑے کی تعریف میں کہتا ہے :-

ورضيت آلاء الكميت فمن يبع فرسا فليس جوادنا بمباع

جوہری نے جس مقام پر اس شعر کی تشریح کی ہے۔ وہاں پوری طمانیت کے ساتھ اس کے قلم نے "آلاء" کا ترجمہ "خصاله الجميلة" (اس کی بہترین عادات) لکھا ہے۔ جو اس لفظ کا صحیح ترین مفہوم ہے لیکن کیسی عجیب بات ہے کہ وہی جوہری جو اس موقعہ پر لفظ کی اصلی حقیقت کو پا چکا ہے۔ مادہ آلاء کی بحث میں جب آلاء کے مفہوم کو بیان کرتا ہے تو محض رائے عام کے اتفاق سے مرعوب ہو کر پائی ہوئی حقیقت کو بالکل فراموش کر دیتا ہے، اور آلاء کے وہی عام معنی "نعمتیں" لکھ کر گذر جاتا ہے۔

فضالہ ابن زید العدوانی جو معمرین میں سے ہے لکھتا ہے :-

وفي الفقر ذل للرقاب وقل ما رايت فقيرا غير نكس مذمم

فقیری میں بہت ہی ذلت ہے میں نے بہت فقیر دیکھے سب شکستہ حال اور مذموم دیکھے

يلام وان كان الصواب بكفه ويحمد آلاء البخيل المدرهم

ان کو ملامت کیجاتی ہے چاہے وہ کتنے ہی اچھا کام کیوں نہ کریں اور دولت مند بخیل کے کارناموں کی تعریف کیجاتی ہے

آخری مصرعہ " ويحمد آلاء البخيل المدرهم " پر اگر ذرا بھی غور کیجئے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ آلاء کے متعلق جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے وہی اس لفظ کی صحیح تحقیق ہے۔ اس موقعہ پر یہ لفظ اپنے اصلی معنی میں

اتنی خوبی اور صفائی کے ساتھ کھپ گیا ہے کہ باوجود کوشش کے بھی مفسرین کا پیدا کیا ہوا مفہوم کسی طرح چسپاں نہیں کیا جا سکتا۔ ابو تمام نے باب طراثی میں بغیر نام کے کسی شاعر کے دو شعر لکھے ہیں۔

اذا ما امرؤ اثنی بآلاء میت — فلا یبعد اللہ الولید بن ادهما

فما کان مفراحا اذا الخیر مسہ — ولا کان منانا اذا ھو انعما

پہلے شعر میں شاعر نے آلاء میت کا تذکرہ کیا ہے اور پھر دوسرے شعر میں آلاء سے اس کی جو مراد تھی خود بیان کر دی ہے کہ مرنے کو جب خیر و بھلائی پہنچتی تو وہ خوشی سے بے قابو نہ ہوتا اور جب کسی کے ساتھ خود بھلائی کرتا تو کبھی احسان نہ جتاتا۔ غور کیجئے اس تفسیر کے اعتبار سے آلاء کے معنی "نعمت" کے کس طرح صحیح ہو سکتے ہیں

خنساء عرب کی مشہور مرثیہ گو کہتی ہے:۔

فبکی اخاک لآلائہ — اذا المجد ضیعہ السؤنا

کلام عرب کی یہ چند مثالیں ہیں، جو آلاء کے صحیح مفہوم پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہیں۔ اگر کلام جاہلیت کا اور وسیع مطالعہ کیا جائے تو ابھی اور بہت سے اشعار اس خیال کی تائید میں مل سکتے ہیں۔ لیکن غیر ضروری طوالت کے خیال سے مزید تفصیل کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

اب آیئے اشعار کی دنیا سے نکل کر خود قرآن مجید کی آیتوں میں غور کریں کہ جہاں جہاں قرآن نے اس لفظ کو استعمال کیا ہے وہاں کس معنی میں استعمال کیا ہے۔ اور قرآن کا نظم کلام، سیاق عبارت اور حسن بیان کس تاویل کو ترجیح دیتا ہے۔

قرآن مجید میں یہ لفظ (آلاء) سب سے زیادہ سورۃ الرحمٰن کی ترجیع میں آیا ہے۔ اس سورہ میں ہر چند آیتوں کے بعد فبای آلاء ربکما تکذبان کی بیدار کرنے والی تنبیہ موجود ہے پوری سورہ کو سامنے رکھ کر اگر غور سے پڑھئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی

عجیب وغریب قدرتوں کو بیان فرمایا ہے۔ اور ہر چند قدرتوں کے بیان کے بعد غافل اور مدہوش مخلوق کو خواب غفلت سے بیدار کرنے اور عمود سورہ (اثبات قیامت) کے ذہن نشین کرنے کے لئے فبای آلاء ربکما تکذبان کی ترجیع فرمائی کہ خدا کی قدرت کے کن کن کرشموں کو جھٹلاؤ گے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو سورہ کا سلسلہ یوں شروع ہوتا ہے۔

"رحمٰن نے قرآن کو سکھایا انسان کو پیدا کیا پھر اس کو بیان کی تعلیم دی۔ سورج اور چاند کو حساب سے رکھا۔ جھاڑ اور درخت سجدے میں ہیں اور آسمان کو بلند کیا اور میزان کو قائم کیا کہ تم تول میں زیادتی نہ کرو۔ ترازو انصاف کے ساتھ سیدھی تولو۔ اور تول میں کبھی گھٹاؤ نہیں اور مخلوق کے لئے زمین بنائی۔ اس میں میوے ہیں، خوشوں والے۔ کھجوریں ہیں۔ بھس والے اناج ہیں اور خوشبودار پھول ہیں۔"

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے فبای آلاء ربکما تکذبان۔

جو باتیں اوپر بیان کی گئی ہیں وہ کیا چیز ہیں؟ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کے چند کرشمے ہیں، ان کرشموں کو بیان کرنے کے بعد کہا جاتا ہے کہ اے غافل انسانو! اور بے خبر جنو! یہ جو اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کے کرشمے تمہاری نظروں کے سامنے ہیں ان میں سے کن کن کرشموں کو تم جھٹلاؤ گے۔ اگر ان میں سے کسی ایک کرشمہ کی بھی تکذیب نہیں کر سکتے تو یہ کیا اندھیر ہے کہ قیامت کے کرشمہ کو اتنی بے دردی کے ساتھ جھٹلا رہے ہو۔ قیامت کا انکار اسی لئے نہ کر رہے ہو کہ وہ ایک اچنبھے کی بات ہے۔ لیکن اللہ کی قدرتوں کے بے شمار نمونے جو عالم آفاق و انفس میں موجود ہیں۔ کیا کوئی اچنبھا ان سے بھی بڑھکر عجیب وغریب اور عقلوں کو حیران کرنے والا ہو سکتا ہے!

سورہ کے انداز کلام کا یہ ایک مختصر نمونہ ہے، اگر غور سے پوری...... سورہ کو پڑھئے تو ہر جگہ یہی

اندازہ نظر آئے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورہ میں انفس و آفاق اور شہود و غیب کے تمام کارناموں کو بیان فرمایا ہے۔ اور پھر موقعہ موقعہ سے انہی ناقابل انکار کارناموں کی طرف اشارہ کرکے قیامت کے متعلق غافل انسانوں اور مدہوش جنوں کو توجہ دلائی ہے۔

لفظ کے اس معنی سے سورہ کی ترجیعات میں جو زور آجاتا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ لفظ کے واقعی مفہوم کو چھوڑ کر ایک غیر واقعی مفہوم کو اختیار کیا جائے۔؟ اور یاد رکھنا چاہیئے کہ لفظ کی غلط تعبیر کی وجہ سے ہمارے مفسرین کو سورہ رحمٰن کی تفسیر میں طرح طرح کی دقتیں پیش آئی ہیں اس لئے کہ آلاء کے معنی نعمتوں کے ہر جگہ کسی طرح استوار نہیں ہوتے۔ بعض آیات میں ایسی چیزوں کو گنایا ہے جو کسی طرح بھی نعمت کے تحت میں نہیں آسکتی ہیں بلکہ ان کا تعلق سر تا سر نقمت اور عذاب سے ہے لیکن اس کے بعد بھی فبای آلاء ربکما تکذبان کی ترجیع ہے یہ وقت یقیناً لفظ کی غلط تاویل کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ اسکی صحیح تاویل واضح ہو جانیکے بعد سورہ رحمان کے تمام مواقع سے اسکی مناسبت میں کسی طرح کی کشمکش باقی نہیں رہجاتی۔

سورۃ النجم کا موقعہ استعمال بھی اسی خیال کا مؤید ہے۔ اس سورہ میں لفظ آلاء جس آیت میں آیا ہے اس آیت سے پہلے مسلسل ۱۰ آیتوں میں سرکشان مکہ کو روز جزا کے اثبات میں حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے صحیفوں کی خبریں سنائی گئی ہیں۔

اَمْ لَمْ یُنَبَّاْ بِمَا فِیْ صُحُفِ مُوْسٰی ۝	کیا اس کو خبر نہیں پہنچی جو موسیٰ کے صحیفوں میں ہے
وَاِبْرَاهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰی ۔ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَۃٌ	اور ابراہیم کے جنھوں نے پورا کیا۔ کہ کوئی اٹھانے والا
وِّزْرَ اُخْرٰی ۝ وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ	کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اور آدمی
اِلَّا مَا سَعٰی ۝ وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ	کو وہی ملتا ہے جو اس نے کمایا۔ اور اس کی کمائی
یُرٰی ۝ ثُمَّ یُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰی ۝	دیکھی جائے گی۔ اور پھر اس کو پورا بدلہ دیا جائے گا
وَاَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی ۝ وَاَنَّهٗ	اور تیرے رب کے پاس ضرور پہنچنا ہے۔ وہی ہنساتا ہے

هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى ۙ وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ	اور وہی رلاتا ہے ، وہی مارتا اور وہی جلاتا ہے ۔ اسی
وَاَحْيَا ۙ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ	نے بنایا جوڑا نر اور مادہ ۔ ایک بوند پانی سے جب ٹپکایا
وَالْاُنْثٰى ۙ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ۙ وَاَنَّ	ہے ۔ اور وہی دوسری مرتبہ پھر پیدا کرے گا ۔
عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى ۙ وَاَنَّهٗ هُوَ	اسی نے دولتمند کیا اور خزانے والا بنایا ۔ وہی
اَغْنٰى وَاَقْنٰى ۙ وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى	پروردگار شعریٰ کا ۔

ان دلائل کے بعد انہی صحیفوں سے مختلف اقوام و امم کی تباہی و ہلاکت کے تاریخی دلائل بھی ان لفظوں میں بیان فرمائے گئے ہیں ۔

وَاَنَّهٗ اَهْلَكَ عَادَا الْاُوْلٰى ۙ	اور یہ کہ اس نے اگلی قوم عاد کو کھپا دیا ۔ اور
وَثَمُوْدَ فَمَا اَبْقٰى ۙ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ	ثمود کو پھر باقی نہ چھوڑا اور نوح کی قوم کو اس سے
قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ	بھی پہلے ۔ وہ تو اور بھی ظالم و شریر تھے اور الٹی
وَاَطْغٰى ۙ وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى ۙ	بستی کو دے مارا پھر اس پر چھایا جو چھایا ۔
فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ۙ	

- - - - - - - - - - - - - - - - -

اور پھر ان قوموں کی تباہی و ہلاکت کے ذکر کرنے کے بعد فرمایا جاتا ہے کہ

فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى	پس تم اپنے رب کے کن کن کرشموں کو جھٹلاؤ گے
هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى	یہ ایک ڈرانے والا ہے اگلے ڈرانیوالوں میں کا

اس موقع پر ہر شخص نہایت آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے کہ سیاق عبارت ، نظم کلام لفظ آلاء سے کس مفہوم کو چاہتے ہیں ؟ اور سلسلہ کلام کس معنی کا متقاضی ہے ؟ اور موقعہ کے پھیلے ہوئے عبرت انگیز خداوندی کارناموں کو ، جس زور اور قوت کے ساتھ قرآن کے لفظ آلاء نے بیان فرمایا ہے وہ "نعمتوں" سے سمجھے جا سکتے ہیں یا "کرشموں" سے ؟

اسی طرح سورۃ الاعراف میں بھی جن مقامات پر یہ لفظ آیا ہے وہ مقامات بھی کچھ اس طرح کے سیاق وسباق سے گھرے ہوئے ہیں کہ کوشش کے باوجود بھی وہاں نعمتوں کے معنی نہیں بن سکتے۔

اس سورہ میں سب سے پہلے یہ لفظ ہود علیہ السلام کی سرگذشت میں آیا ہے۔ ہود علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی دعوت دی۔ تو کفار کے سرغنوں نے کہا کہ تم بڑے بیوقوف اور بالکل جھوٹے ہو۔ انا لنرٰک فی سفاھۃ وانا لنظنک من الکاذبین۔ تو آپ نے فرمایا کہ کبھی ایسا بات نہیں ہے تم نے غلط سمجھا۔ نہ تو میں بیوقوف ہوں اور نہ جھوٹا بلکہ میں تو خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔ اور اس کے پیغام کی تم کو دعوت دے رہا ہوں۔ اور یقین مانو کہ میں تمہارا بہت ہی خیرخواہ ہوں۔ باقی اگر تم کو اس بات پر تعجب ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں میں سے ایک آدمی کو اپنی پیغام بری کے لئے کیوں منتخب کر لیا؟ تو یہ بنا وٹ بھی تمہارے لئے کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہونی چاہیے۔ وہ وقت یاد کرو جب نعمت اللہ تعالیٰ نے قوم نوح کے بعد تم کو جانشین بنایا۔ پس جو حال آج میرا تمہارے سامنے ہے کل وہی حال تمہارا اس قوم کے سامنے تھا۔ پس اس وقت اللہ تعالیٰ نے جو کچھ کیا، اس کو یاد کرو۔ اس میں تمہارے لئے کافی عبرت ہے۔ فاذکروا آلاء اللہ لعلکم تفلحون۔

یہ موقع لفظ کی اصل حقیقت کو بے نقاب کرنے کے لئے بالکل واضح ہے۔ اتنا واضح کہ کسی تشریح کی قطعی ضرورت نہیں۔ یہاں پر "آلاء اللہ کے معنی" افعال اللہ" کے سوا کچھ اور بن ہی نہیں سکتے ہیں۔

اس کے بعد ٹھیک اسی طرح یہ لفظ صالح علیہ السلام کی سرگذشت میں آیا ہے۔ آپ نے بھی دعوت توحید اور حفاظت ناقہ کے بعد قوم کو مخاطب کر کے فرمایا:-

وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ	اور یاد کرو جس وقت تم کو عاد کے بعد جانشین بنایا
بَعْدِ عَادٍ وَبَوَّأَكُمْ فِي الْأَرْضِ تَتَّخِذُونَ	اور زمین میں تم کو جگہ دی۔ بناتے ہو اس کے نرم حصوں میں
مِنْ سُهُولِهَا قُصُورًا وَتَنْحِتُونَ	محلیں اور پہاڑوں کو کاٹ کر مکان۔ پس اللہ تعالیٰ

اَلْجِبَالَ بُيُوتًا۔ فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللهِ کی کاریگریوں کو بھی یاد رکھو اور زمین میں فساد مچاتے

وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ مت پھرو۔

یعنی قوم عاد کی ہلاکت و بربادی کا حال تو تم کو معلوم ہے کہ ہودؑ اور ان کے مٹھی بھر شکستہ حال ساتھیو ں کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے عاد کی سرکش قوم کو چشم زدن میں جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا۔ فانجیناہ والذین معہ برحمۃ منا وقطعنا دابر الذین کذبوا بایتنا وما کانوا مومنین (اعراف) اس لئے چاہئے کہ تم بھی اپنی تمدنی اور عمرانی ترقیوں پر مغرور ہو کر زمین میں فساد مچاتے مت پھرو۔ اللہ کی اعجوبہ کاریوں کو بھی یاد میں رکھو۔

یہ ہیں قرآن مجید کے وہ مواقع جنمیں آلاء کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ان تمام مقامات پر نظم کلام اور سیاق عبارت کی واضح روشنی میں لفظ کا جو وسیع اور جامع مفہوم سمجھ میں آتا ہے اس کی صحیح تعبیر کے لئے نعمت کا لفظ بالکل ناکافی ہے۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

تفسیر سورہ کوثر

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۃ الکوثر کا اردو ترجمہ ہے اس میں کوثر کی تحقیق، خانہ کعبہ کی روحانی حقیقت اور نماز اور قربانی کے اسرار و حقائق پر مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس کی اصلی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ کتابت و طباعت جاذب نظر۔ کاغذ عمدہ۔ تقطیع $\frac{20\times30}{16}$ حجم ۱۲۳ صفحے۔ قیمت ۸/

مینیجر

موعظۂ حسنہ

روزہ

از جناب مولوی حافظ عبد الواحد صاحب اصلاحی

دنیا میں جتنے مذاہب ہیں ان سب میں کسی نہ کسی نوع کی جسمانی عبادت کا حکم موجود ہے۔ اسلام نے بھی اپنے پیرؤوں پر جسمانی عبادت فرض کی ہے۔ جس کا نام روزہ ہے۔ عربی میں روزہ کے لئے صوم و صیام کا لفظ مستعمل ہے۔ صوم و صیام کے معنی کھانے، پینے اور بات چیت سے رکے رہنے کے ہیں۔ لغت میں اس گھوڑے کو بھی کہتے ہیں، جسے ایک خاص انداز تربیت پر جنگ کے لئے تیار کیا جائے۔ اس کی صورت عموماً یہ ہوتی تھی کہ گھوڑے کو خوب کھلا پلا کر تنومند کرتے، جب جسمانی حیثیت سے وہ پوری ترقی کر لیتا، اسے سخت دھوپ میں باندھتے۔ تیز و تند ہوا میں ہوا کے رخ کے خلاف کھڑا کرتے۔ دانے گھاس میں تدریجاً کمی کرتے رہتے۔ اس طرح اسے سردی گرمی بھوک پیاس کی شدت و تکلیف جھیلنے کا خوگر بناتے کہ لڑائی میں پیش آنے والی سختیوں کا مقابلہ کر سکے۔

مفہوم کے لحاظ سے یہ لفظ کسی ایسے ہی عمل کے لئے بولا جا سکتا ہے جو کسی اہم اور اعلیٰ مقصد کیلئے ہو۔ اور جس میں انسان کی اخلاقی اور روحانی تربیت کیساتھ اسکی جسمانی تربیت کا پہلو بھی مد نظر ہو۔

نوع انسانی کو روزہ کی ضرورت

بنی نوع انسان کی فطرت کچھ اسطرح کی ہے کہ بغیر تعلیم و تربیت اس کی فطری قوتیں نہیں ابھر سکتیں۔ اور چونکہ وہ جسم و روح دونوں سے مرکب ہے۔ اس لئے ضروری تھا کہ اس کی جسمانی اور روحانی تربیت کے لئے کوئی ایسا عمل ہو جس میں روح و جسم دونوں کی تربیت ملحوظ ہو۔

اس ضرورت کی تکمیل کے لئے روزہ ایک بہترین عمل (عبادت) ہے تفصیل آگے آئیگی۔

شریعت کی اصطلاح میں روزہ کا مفہوم

شریعت کی اصطلاح میں سحر کے وقت سے غروب آفتاب تک خاص آداب و شرائط کے ساتھ کھانے پینے اور جنسی خواہشوں سے رکے رہنے کا نام روزہ ہے ساتھ ہی روزہ دار کے لئے حکم ہے کہ اپنی زبان، اپنے قلب اور اپنے اعضاء و جوارح کو ناروا باتوں سے محفوظ رکھے۔ زبان گالی گلوچ کے لئے نہ کھلے، دل وساوس سے پاک ہو کر یاد الٰہی میں مشغول رہے۔ ہاتھ کسی کے خلاف نہ اٹھیں اور قدم کوئی بری راہ نہ چلیں۔ ظاہر ہے کہ جس عمل کے یہ آداب و شرائط ہوں وہ نہایت عظیم الشان ہوگا۔

اسلامی روزہ دوسرے مذاہب کی جسمانی عبادات کے مقابل میں سہل العمل عبادت ہے

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ دنیا میں جتنے مذاہب ہیں ان سب میں کسی نہ کسی شکل میں جسمانی عبادت کا حکم ہے لیکن اسلام اور ان مذاہب کی عبادتوں میں عظیم الشان فرق ہے۔ اسلام کی یہ عبادت نہایت سہل العمل ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

یُرِیدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیدُ	خدا تمھارے ساتھ آسانی چاہتا ہے۔
بِکُمُ الْعُسْرَ	سختی نہیں چاہتا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ دوسرے مذاہب نے خبیث و نفع بیب جسمانی کو بھی ایک قسم کی عبادت بنایا ہے۔ اس تخیل کا اثر یہ ہے کہ ہندو جوگیوں نے سخت سے سخت جسمانی ریاضتوں کی بنیاد ڈالی جن میں سالہا سال تک کھڑے رہنا، سخت دھوپ میں قیام کرنا، گرمی کے دنوں میں آگ کے شعلوں کے دائروں میں بیٹھنا جاڑوں میں برہنہ تن رہنا۔ دس دس برس تک ایک ہاتھ کو ہوا میں بلند رکھنا۔ سالہا سال تک ایک نشست پر قائم رہنا ایک ایک چلہ تک کھانا پینا چھوڑ دینا، تقرب الٰہی کے حقیقی راستے تھے۔

جینی فرقہ ناک، کان، اور منہ کو بند رکھتا ہے کہ کسی کیڑے کو اذیت نہ ہو۔ بدھ فرقہ کے بھکشو جنگلوں اور پہاڑوں میں رہتے تھے۔ گھاس اور پتوں اور بھیک کے ٹکڑوں پر گذر اوقات کرتے تھے۔

ہندو جوگی چلے کھینچتے تھے جن میں کھانا پینا بالکل چھوڑ دیتے۔ کبھی کبھار ایک دو لقمہ کھا لیتے۔ نصرانی راہبوں نے رہبانیت کی بنیاد ڈالی جس کے رو سے شادی بیاہ حرام کر لیا۔ ترک آسائش، مرغوب ترین عبادت قرار دی۔ کئی کئی روز کھانا پینا چھوڑ دینا، زہد و تقویٰ کی انتہا تھی۔ یہودیوں کے ہاں قربانی کے شرائط و ضروریات کا بیان تورات کے چار پانچ صفحوں میں مذکور ہے۔ افطار کے بعد صرف ایک بار کھانا کھا سکتے تھے۔ اس کے بعد دوسرے روز افطار کے وقت تک کچھ نہ کھاتے۔ اگر بغیر کھانا کھائے نیند آ گئی تو پھر کھانا مطلق حرام تھا۔ روزے کے ایام میں بیویوں سے نہیں مل سکتے تھے۔

اسلام نے سب سے پہلے روزے کے اوقات کی تحدید کی۔ بعض لوگ زہد و تقویٰ کی راہ سے عمر بھر روزے رکھتے تھے۔ اسلام نے اس کو بالکل رد کر دیا۔

لا صام من صام الابد — جس نے ابد روزہ رکھا اس نے روزہ نہیں رکھا۔

اسلام کے سوا اور ادیان ملل میں رات دن کا روزہ ہوتا تھا۔ اسلام نے روزے کی مدت صرف صبح سے شام تک ٹھہرائی ہے۔

أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ — روزہ کو رات تک پورا کرو۔

ایام جاہلیت میں دستور تھا کہ روزے کی پوری مدت میں مباشرت سے محترز رہتے۔ لیکن چونکہ یہ ممانعت خلاف فطرت تھی، اس لئے اکثر لوگ اس میں خیانت کے مرتکب ہوتے۔ اسلام نے اس حکم کو صرف وقت صوم تک کے لئے محدود کر دیا۔ یعنی صبح سے شام تک۔

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ	تمھارے لئے روزے کی شب میں اپنی بیویوں سے
إِلَىٰ نِسَائِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ	مقاربت حلال کی گئی۔ وہ تمھارے لئے لباس ہیں اور
لِبَاسٌ لَهُنَّ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ	تم ان کے لئے لباس ہو۔ اللہ کو معلوم ہو گیا کہ
تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا	تم اپنے آپ سے خیانت کرتے تھے۔ پس اس نے تم کو معاف

عَنۡکُمۡ فَالۡـٰٔنَ بَاشِرُوۡهُنَّ وَابۡتَغُوۡا   کیا۔ اب ان سے ملو جلو اور خدا نے جو لکھا ہے

مَا کَتَبَ اللّٰهُ لَکُمۡ (بقرہ)   اس کو چاہو۔

عمل روزہ کی مصلحت | شریعت کی اصطلاح میں روزہ سے جو طریق عبادت مفہوم ہے۔ وہ بظاہر ایک جسمانی تعذیب ہے لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ یہ طریق عبادت ۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خاص حکمت پر مبنی ہے۔ انسان میں دو قوتیں کارفرما ہیں۔ ملکوتی اور بہیمی۔ بہیمی قوتوں کو نشو و نما کے عموماً زیادہ مواقع ملتے ہیں اس لئے یہ قوت غالب رہتی ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ بہیمی قوتوں کی نشو و نما کا سہارا غذائیں ہیں پس اگر انھیں غذائیں کم پہنچیں گی تو ضرور ہے کہ ان کی شدت اور جوش میں کمی پیدا ہو گی اور جب یہ کمزور ہوئیں تو لازماً ملکوتی قوتوں کو ابھرنے اور بڑھنے کا موقع ملیگا۔ اب سوچئے روزہ سے یہ مقصد آسانی اور خوبی سے حاصل ہو سکتا ہے یا نہیں؟ تجربہ شاہد ہے کہ روزے ہی سے یہ مقصد پورا ہو سکتا ہے۔

روزہ کا مقصد تقوی پیدا کرنا ہے | شریعت کا ہر حکم کسی نہ کسی حکمت پر مبنی ہے۔ روزہ کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے اندر تقوی پیدا ہو

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا کُتِبَ عَلَيۡکُمُ   مسلمانو! جس طرح تم سے پہلے لوگوں (یعنی اہل کتاب)

الصِّيَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَى الَّذِيۡنَ   پر روزہ رکھنا فرض تھا تم پر بھی فرض کیا گیا ہے تاکہ

مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ   تم میں تقوی پیدا ہو۔

یہ کھلی بات ہے کہ انسان کی قوت ملکوتیہ نشو و نما پائیگی تو رفتہ رفتہ اس میں ایک خاص استعداد اور صلاحیت پیدا ہو گی جس کو قرآن نے تقوی سے تعبیر کیا ہے۔ تقوی یہ ہے کہ انسان کو ہر آن اور ہر موقع پر خدا کا تصور ہو۔ اس کی نافرمانی کے خیال سے دل میں کپکپی اور روح میں لرزش پیدا ہو جائے۔ یہ بات واضح ہے کہ نافرمانی کا دروازہ بند کرنا تقوی کا پہلا قدم ہے۔ روزہ دار مباح چیزوں اور جائز خواہشوں کو ترک کر کے نفس امارہ کو سمجھا دیتا ہے کہ اس کے لئے حرام چیزوں اور ناجائز خواہشوں

کی طرف رخ کرنے کی کچھ بھی گنجائش نہیں ہے۔

روزہ میں تشبہ بالملائکہ ہے مخلوقات الٰہی میں فرشتے سب سے زیادہ مطیع و منقاد مخلوق ہیں۔ وہ مادی آلودگیوں سے بالکل پاک ہیں۔ ان کی غذا خداوند تعالیٰ کی تقدیس و تحمید ہے۔ ان کی فطرت نیکی، اطاعت اور معصومیت ہے۔ وہ مخلوق کی خاطر ہمہ وقت سرگرم استغفار رہتے ہیں۔ کھانے پینے اور اوڑھنے بچھونے کی ساری احتیاجات سے مستغنی ہیں۔ قرآن مجید میں ان کی صفت یہ بیان کی ہے کہ لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ .... وَالْمَلٰٓئِکَۃُ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّھِمْ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِی الْاَرْضِ (اور فرشتے ہیں کہ اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ (اس کی) تسبیح و تقدیس میں لگے رہتے ہیں اور جو لوگ زمین میں ہیں ان کے لئے توبہ استغفار کیا کرتے ہیں)۔

انھیں سامنے رکھکر، ایک روزہ دار کی حالت پر غور کیجئے۔ ایک انسان ہے، مادیات سے رغبت اسکی فطرت ہے۔ کھانا پینا اس کی زندگی کا سہارا ہے۔ جنسی ترغیبات سے گھرا ہوا ہے۔ اسکی خمیر میں ہے کہ دنیا کی چیزوں سے لطف اندوز ہو لیکن دفعتہً ان تمام مادی مرغوبات سے کنارہ کش، کھانے پینے سے الگ اور شہوانی خواہشات سے نفور ہو جاتا ہے۔ زبان خدا کی حمد وثنا میں زمزمہ سنج ہو جاتی ہے اور دل اس کے ذکر وفکر میں ڈوب جاتا ہے۔ کیا یہ انسان فرشتوں کی راہ نہیں چل کھڑا ہوا ہے۔ کیا اس نے نیکی اور پاکی کی وہ زندگی نہیں اختیار کرلینی چاہی ہے جو خدا کی نظروں میں سب سے زیادہ محبوب ہے؟

روزہ سے ضبط نفس پیدا ہوتا ہے انسانی طبیعت بہت بےچین، عجلت پسند، اور جلد باز واقع ہوئی ہے۔ جہاں نفس کی طرف سے کوئی طلب ہوئی آدمی اس کے پورا کرنے میں فوراً لگ گیا۔ بھوک پیاس اور اسی طرح کی دوسری ضرورتوں میں ہم نفس انسانی کی کمزوریوں کا تجربہ روز کرتے ہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جوں ہی آدمی کو بھوک کا احساس ہوا۔ یا پیاس لگی، بےچین ہو کر آب ودانہ کی جستجو میں سرگرم

ہو گیا۔ اس وقت اس کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اپنا پیٹ بھرے۔ وہ یہ بہت کم دیکھتا ہے کہ یہ چیز اس کو کہاں سے ملی اور کس طرح ملی۔ لیکن یہی انسانی سیرت ایک روزہ دار کے اندر بالکل مختلف حالت میں نظر آتی ہے۔ اس کو سخت سے سخت بھوک لگی ہے۔ شدت تشنگی سے بیتاب ہے۔ زبان سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے۔ غذا سامنے موجود ہے۔ صاف شیریں پانی بھی سامنے ہی رکھا ہوا ہے۔ بے تکلف کھا پی سکتا ہے۔ بایں ہمہ وہ ان چیزوں میں سے کسی چیز کو بھی ہاتھ نہیں لگاتا۔ اور صبح سے شام تک کے لئے طبیعت کے سارے تقاضوں کو بالکل معطل کر دیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب نفس کو اس طرح اس کے تقاضوں اور خواہشوں کے خلاف عمل کرنے کا خوگر بنایا جائے گا۔ تو انسان میں ہمت و عزیمت کی وہ روح ضرور پیدا ہو جائے گی جس سے اس کے تمام انسانی کمالات کی زندگی ہے۔

روزے سے عملی مساوات اور ہمدردی کی روح پیدا ہوتی ہے

انسان جب تک خود تکلیفوں سے دوچار نہیں ہوتا تکلیف کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ جو لوگ دولتمند ہیں وہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں وہ دوسروں کی بھوک پیاس کی تکلیف کا صحیح احساس ہرگز نہیں کر سکتے۔ اور آہستہ آہستہ وہ سنگدل ہو کر تمام انسانی صفات و خصوصیات سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اسلام نے اسی روگ سے بچانے کے لئے اپنے پیرووں پر روزہ فرض کیا کہ دولتمند روزے رکھکر بھوک پیاس کی تکلیفوں کا عملی تجربہ حاصل کریں۔ تاکہ ان میں غریبوں کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا احساس پیدا ہو۔ پس روزہ سے ایک طرف ہمدردی کی روح پیدا ہوتی ہے۔ دوسری طرف عملی مساوات کی تعلیم ملتی ہے۔ روزہ کے ایام میں شاہ و گدا دونوں گویا ایک ہی تعلیم گاہ میں تربیت حاصل کرتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کو بہت قریب سے دیکھنے لگتے ہیں۔

روزہ شکر گذاری کی عملی تصویر ہے۔

جس طرح نماز قدرت کی ان نعمتوں پر جو انسان کو ہر وقت ملتی رہتی ہیں۔ شکرگذاری کی عملی تصویر ہے اسی طرح نزول قرآن کی نعمت پر روزہ شکر و ممنونیت کی

ایک علمی تصویر ہے۔ نزول قرآن کا نعمت و رحمت ہونا بالکل واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت یہی ہے۔ اسی نے انسانیت کے لئے دائمی زندگی اور نجات کا دروازہ کھولا۔ اور روح کو جسم پر اور ملکیت کو بہیمیت پر فتح دی۔ پس ضروری ہوا کہ اس فتح کی خوشی اور شکرگذاری کے لئے ایک مخصوص مہینہ ہو جس میں انسان پاکی اور طہارت کے تمام لوازم اور تجرد و انقطاع کی ممکن سعی کے ساتھ اللہ کی اس نعمت اور روح کی اس فتح پر خوشی منائے اور شکرگذار ہو۔

ذیل کی آیت میں اسی شکرگذاری کی دعوت ہے۔

وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (بقرہ)

اور تاکہ تم گنتی پوری کرلو، اور تاکہ اس ہدایت پر جو تمکو بخشی ہے اللہ کی بڑائی کرو تاکہ تم شکرگذار رہو۔

روزہ سے جہاد کی روح پیدا ہوتی ہے۔ انسان نے جو فطرت پائی ہے۔ اس کا اقتضاء ہے کہ وہ حق سے محبت کرے اور باطل سے نفرت۔ حق سے محبت کرنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ انسان عمدہ صفات اور اعلیٰ جذبات کا حامل ہو۔ اور اپنی ان قوتوں پر پوری طرح قابو حاصل کرلے جو راستی سے ہٹا کر غلط اور باطل راہ پر لگا دیتی ہیں اور ان پر قابو حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے مقدم شرط اپنے نفس سے جہاد ہے۔ پس روزہ رکھ کر روزہ دار اپنے نفس سے جہاد شروع کر دیتا ہے اور اس طرح رفتہ رفتہ اس کے اندر جہاد کی وہ روح پیدا ہو جاتی ہے جو حق کی حمایت اور باطل کے استیصال کے لئے ہمیشہ سرگرم رہتی ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اگر صحیح ہے تو سوال یہ ہے کہ روزے سے وہ نتائج کیوں نہیں پیدا ہوتے جو پیدا ہونے چاہئیں۔ جواب یہ ہے کہ نتائج عمل کے ظہور کے لئے کچھ اصول و شرائط ہیں۔ جب ان شرائط پر پابندی کے ساتھ عمل کیا جائے گا، صحیح نتائج کا ظہور ہوگا اور جب انھیں نظرانداز کر دیا جائے گا، صحیح نتائج نہیں پیدا ہو سکیں گے۔ پس روزے کی تکمیل کے لئے پہلی اور بنیادی شرط خلوص ہے۔ جو روزہ خلوص نیت سے خالی ہے وہ روزہ نہیں ہے فاقہ ہے۔ صرف کام و دہن تک

اکل و شرب سے محترز رکھنا روزہ نہیں ہے بلکہ روزہ یہ ہے کہ تمام ظاہری و باطنی اعضا، و جوارح اور قوی و احساسات صائم ہو جائیں۔ ہاتھ پاؤں، آنکھ اور دل منکرات سے آلودہ نہ ہوں۔ زبان بدگوئی اور کذب و افترا سے آشنا نہ ہو۔ اور اگر ان باتوں کا لحاظ نہ کیا جائے تو یقیناً یہ روزہ مقبول نہ ہوگا۔

انجیل میں ہے۔

"دیکھو تم اس مقصد سے روزہ رکھتے ہو کہ جھگڑا رگڑا کرو۔ اور شرارت کے مکے مارو۔ پس اب تم اس طرح کا روزہ نہیں رکھتے ہو کہ تمھاری آواز عالم بالا پر سنی جائے۔ کیا یہ وہ روزہ ہے جو مجھکو پسند ہے؟ ایسا دن کہ اس میں آدمی اپنی جان کو دکھ دے، اور اپنے سر کو جھاؤ کی طرح جھکائے اور اپنے نیچے ٹاٹ اور راکھ بچھائے؟ کیا تو اس کو روزہ دار اور ایسا دن کہے گا جو خداوند کا مقبول ہو۔ کیا وہ روزہ جو میں چاہتا ہوں یہ نہیں کہ ظلم کی زنجیریں توڑیں اور جوئے کے بندھن کھولیں اور مظلوموں کو آزاد کریں بلکہ ہر ایک جوئے کو توڑ ڈالیں کیا یہ نہیں کہ تو اپنی روٹی بھوکوں کو کھلائے اور مسکینوں کو جو آوارہ ہیں اپنے گھر میں لائے اور جب کسی کو ننگا دیکھے تو اسے پہنائے اور تو اپنے ہم جنس سے روپوشی نہ کرے تب تیری روشنی صبح کے مانند پھوٹ نکلے گی۔ اور تیری صحت کی ترقی جلد ظاہر ہوگی۔ تیری صداقت تیری ہراول ہوگی اور خداوند کا جلال تیرا چنڈاول ہوگا" (یسعیاہ باب ۵۸)

ایک دوسری جگہ ہے:-

"اور جب تم روزہ رکھو تو ریاکاروں کی طرح اپنی صورت اداس نہ بناؤ کیونکہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں تاکہ لوگ ان کو روزہ دار جانیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اجر پا چکے بلکہ جب تو روزہ رکھے تو اپنے سر میں تیل ڈال اور منہ دھو تاکہ آدمی نہیں بلکہ تیرا باپ جو پوشیدگی میں ہے۔ تجھے روزہ دار جانے۔ اس صورت میں تیرا باپ جو پوشیدگی میں ہے دیکھتا ہے تجھے بدلہ دے گا" (متی باب ۶)

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ روزہ دراصل وہ ہے جس میں خلوص نیت کی کار فرمائی ہے۔

پس جو روزے خلوص نیت کے ساتھ رکھے جائیں گے، مطلوبہ نتائج صرف ان ہی سے حاصل ہوں گے۔

خلاصہ پچھلی سطروں میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ انسان چونکہ جسم و روح دونوں سے مرکب ہے اس لئے دنیا میں جتنے مذاہب ہیں سب میں جسمانی عبادت کا حکم موجود ہے مگر اسلام کے سوا اور مذاہب کی جسمانی عبادتیں انسانی فطرت سے ہم آہنگ نہیں۔ البتہ اسلام کی جسمانی عبادت نہایت سہل العمل اور فطرت کے مطابق ہے۔ چونکہ عبادت کا مقصد طہارت روح ہے اس لئے اسلام نے اسی اصل پر زیادہ زور دیا ہے اور روح میں پاکیزگی پیدا کرنے کا وہ طریقہ اختیار کیا ہے جس سے مسلمانوں میں تقویٰ کے ساتھ جہاد کا صحیح اور سچا جذبہ پیدا ہو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ صبر و عزیمت جو جہاد کے لئے اولین شرط ہے۔ وہ روزہ کی اصلی خصوصیت ہے روزہ رکھکر آدمی اپنے نفس سے جہاد شروع کر دیتا ہے اور اس طرح جہاد کی پہلی منزل میں قدم رکھ دیتا ہے۔

مقالات

مولانا حمید الدینؒ!

ولادت ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۳ء - وفات ۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۰ء

از حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ

یہ مضمون معارف نمبر ا و ۲ جلد ۲۷ میں شایع ہو چکا ہے۔ (اڈیٹر)

فغاں کہ گشت نیوشندہ سخن خاموش   دگر چگونہ تسلی کنم من این لب و گوش
(حمید)

اس سے پہلے ہندوستان کے جن اکابر علمار کا ماتم کیا گیا ہے، وہ کل وہ تھے، جن کی ولادت اور نشو و نما انقلاب زمانہ سے پہلے ہوئی تھی، آج سب سے پہلی دفعہ ہم نئے عہد کے سب سے پہلے عالم کی وفات کے ماتم میں مصروف ہیں، ہم ایک ایسے گرامی قدر عالم کا ماتم کرتے ہیں جو اپنے علم و فضل، زہد و ورع، اور اخلاق و فضائل میں قدیم تہذیب کا نمونہ تھا، لیکن جو اپنی روشن خیالی، جدید علوم و فنون کی اطلاع و واقفیت اور مقتضیات زمانہ کے علم و فہم میں عہد حاضر کی سب سے بہتر مثال تھا، اس سے پہلے ان تمام علمار نے جو نئے علم کلام کا اپنے کو بانی کہتے اور سمجھتے ہیں، جو کچھ کہا اور لکھا، وہ دوسروں سے سنی سنائی باتیں تھیں، لیکن اس جماعت میں یہ پہلی ہستی تھی، جس نے فلسفۂ حال کے متعلق نفیاً یا اثباتاً جو کچھ کہا اور لکھا وہ اپنی ذاتی تحقیق اور ذاتی علم و مطالعہ ہے۔

آج ہمارے سامنے ایسے متعدد علمار کی مثالیں ہیں جنھوں نے عربی علوم کی تکمیل کے بعد انگریزی تعلیم شروع کی، اور بی، اے اور ایم۔ اے اور پی، ایچ، ڈی، کی سندیں حاصل کیں، لیکن اس طرح کہ

جو پڑھا لکھا تھا نیاز نے اسے صاف دل سے بھلا دیا

نئے رنگ نے پرانے رنگ کو اتنا پھیکا کر دیا کہ اُن پر اُس کا نشان بھی نظر نہیں آتا، لیکن آج ہم جس شخص کا تذکرہ کر رہے ہیں، اس کا یہ حال تھا کہ اس کے نئے رنگ کی شوخی سے اس کے پرانے رنگ کا گہراپن اور بڑھ گیا تھا اور اس کو دیکھ کر یہ سمجھنا بھی مشکل تھا کہ یہ علی گڈھ کالج اور الہ آباد یونیورسٹی کا گریجویٹ ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ اس کی سادگی کو دیکھ کر عوام بظاہر اس کو عالم بھی مشکل ہی باور کر سکتے تھے، مگر وہ تھی، جو ابنائے زمانہ میں کوئی نہیں۔

<u>ولادت</u> | اعظم گڈھ سے دو اسٹیشن پہلے پھریہا ایک گاؤں ہے، وہی مولانا کا پدری وطن تھا، اسی پھریہا کو عربی شکل دیکر مولانا اپنے نام کے ساتھ کبھی کبھی فراہی لکھا کرتے تھے، مولانا شبلی مرحوم اور مولانا حمید الدین میرے پھوپھیرے بھائی تھے، مولانا حمید الدین کے والد مولوی عبد الکریم صاحب مولانا شبلی کے ماموں تھے، دونوں بھائیوں کی پیدائش چھ برس آگے پیچھے ہوئی، مولانا شبلی سنہ ۱۲۷۵ھ ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے، اور مولانا حمید الدین صاحب سنہ ۱۲۸۰ھ ۱۸۶۲ء میں، مولانا حمید الدین کے حقیقی چھوٹے بھائی شیخ حاجی رشید الدین صاحب ہیں، جو علی گڈھ کالج کے پرانے تعلیم یافتوں میں ہیں اور سر سید کے عہد کے طالب العلم ان سے اچھی طرح واقف ہیں۔

مولانا کا اصلی نام تو حمید الدین تھا، مگر وہ اس نام کو جو درحقیقت عربی قاعدہ سے لقب ہے، اپنی لُغوی معنوی حیثیت سے بلند سمجھتے تھے، اس لئے وہ عربی تصانیف میں اپنا نام عبد الحمید لکھتے تھے اور تمام بڑے بڑے عالمانہ آداب و القاب کو چھوڑ کر صرف معلم کہلانا اپنے کو پسند فرماتے تھے، بنا بریں، وہ اپنا نام المعلم عبد الحمید الفراہی، کتابوں کی لوحوں پر لکھا کرتے تھے۔

<u>تعلیم</u> | مولانا نے پہلے حفظ شروع کیا، اور قرآن مجید کے حافظ ہوئے، اور فارسی کی ابتدائی کتابیں اسی ضلع کے ایک دیہات چتارا کے باشندہ مولوی مہدی حسین صاحب سے پڑھیں، اس زمانہ میں شرفا کی تعلیم کا فارسی ادب سب سے اہم جزو تھا، مولانا کو ادبیات سے فطری لگاؤ تھا، چنانچہ فارسی زبان اور فارسی

ادب کا ذوق بچپن سے ان میں نمایاں تھا، اس وقت مولانا شبلی مرحوم عربی کی اعلیٰ کتابیں اعظم گڈھ میں مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی سے پڑھ رہے تھے، مولانا فاروق صاحب اپنے عہد کے سب سے بڑے عالم ہونے کے ساتھ فارسی کے بھی بہت بڑے ادیب اور استاد تھے، مولانا حمید الدین صاحب کی آمد و رفت یہاں بھی رہا کرتی تھی، اور یہ عالمانہ صحبتیں ان کو ملا کرتی تھیں۔

ابھی مولانا کی عمر سولہ برس کی تھی، کہ فارسی کے سب سے مشکل گو شاعر خاقانی شروانی کے تتبع میں ایک قصیدہ لکھا جس کی ردیف آئینہ اور قافیہ جوہر کیفر وغیرہ ہے، سلطان عبد الحمید خاں کی مدح میں ہے، مطلع ہے۔

بے جلوہ رخ تو بود مضطر آئینہ | خار افگند بہ پیرہن از جوہر آئینہ

بعد کے شعر ہیں۔

گیسوئے ہمچو شب تو بیارائے دم بصبح | فرمائے تو بیاد رد از خاور آئینہ

گستاخ دیدہ است بروئے تو لاجرم | چشم سپید یافت بدیں کیفر آئینہ

آئینہ واگذار و بیاورد و دیدہ ام | چشم بود ز آئینہ بہتر ہر آئینہ

در بزم انس خویش چرا جائے دادہ | تا می شود برابر تو اکثر آئینہ

کے با ضمیر شاہ شود ہمسر آفتاب
کے روئے ہمچو ماہ ترا ہمسر آئینہ

۲۸ شعروں کا قصیدہ تھا، لوگوں کو پڑھکر بڑی حیرت ہوئی، یہ فارسی، یہ لطف زبان، یہ شیرینی اور یہ شکوہ دیکھکر سب کو تعجب تھا، مولانا شبلیؔ فرماتے تھے، کہ میں نے اس کو لیجا کر مولانا فاروق صاحب کو دکھایا اور یہ پوچھا کہ آپکے نزدیک یہ کس کا کلام ہے، انھوں نے فرمایا یہ تو نہیں بتا سکتا مگر قدما میں سے کسی کا معلوم ہوتا ہے، مولانا شبلی نے فرمایا یہ حمید کا ہے، حیرت ہو گئی۔

مولانا حمید الدین صاحب فطرۃً نہایت ذہین، نہایت طباع، اور نہایت دقیقہ رس تھے، انکا ذہن نہایت صاف تھا، وہ اول ہی وہلہ میں بے کج و پیچ حقیقت کی منزل مقصود تک پہنچ جاتے تھے، ان کا تیر نظر مسائل کی تشریح اور مشکلات کے حل میں ہمیشہ نشانہ پر بیٹھتا تھا، دماغ اتنا سلجھا تھا، کہ کتنا ہی پیچیدہ مسئلہ ہو وہ اس کی اصل تہ تک پہنچ جاتے تھے، اور اگر وہ مناظرہ پر اتر آتے تو کیسی ہی غلط بات ہو وہ اسکی ایسی عمدہ عمدہ دلیلیں پیش کرتے تھے کہ حریف ساکت ہو جاتا تھا، اور سمجھ لیتا تھا کہ یہ مولانا کی اصلی رائے ہے، مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ مسکرا کر فرماتے کہ یہ تو غلط تھا، اصلیت یہ ہے۔

فارسی کے بعد مولانا نے عربی کی تعلیم شروع کی اور بھائی (مولانا شبلیؒ) سے عربی پڑھنے لگے، چنانچہ متوسطات تک مولانا شبلی ہی سے تعلیم پائی، مولانا شبلی جب یہاں سے باہر نکلے تو یہ بھی گئے، لکھنؤ جاکر مولانا حمید الدین صاحب نے فرنگی محل میں، مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی سے کچھ پڑھا، اس زمانہ میں لکھنؤ میں خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز لکھنوی (پروفیسر فارسی کیننگ کالج لکھنؤ و مصنف قیصر نامہ) لکھنؤ میں فارسی کے نہایت مستند استاد اور شاعر تھے، ان کی صحبتوں میں شرکت کا اتفاق ہوتا رہا، اور ان دونوں بھائیوں سے خواجہ صاحب کے اسی فارسی کے رشتہ سے تعلقات محبت، عزیزانہ حیثیت تک پہنچ گئے تھے، لکھنؤ کے بعد مولانا لاہور جاکر مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری سے عربی ادب کی کتابیں پڑھیں، اس زمانہ میں یہاں نیا نیا اورینٹل کالج کھلا تھا، مولانا فیض الحسن صاحب اپنے عہد کے مشہور ادیب اس کالج میں مدرس تھے، ان کا نام سنکر دور دور سے طلبہ پڑھنے آتے تھے، لیکن مولانا حمید الدین صاحب نے مولانا فیض الحسن صاحب سے خارج میں پڑھا، وہیں انکی ملاقات مولوی وحید الدین صاحب سلیم پانی پتی سے ہوئی، اور وہ دوستی تک پہنچی، جو آخر تک قائم رہی، اور اسی دوستی کی کشش تھی کہ مولوی وحید الدین صاحب سلیم جامعہ عثمانیہ حیدرآباد تک پہنچے۔

مولانا بیس برس کی عمر میں ۱۳۰۶ھ ۱۸۸۸ء میں عربی تعلیم سے فارغ ہوگئے، اور عربی ادب میں بھی وہ کمال حاصل کیا کہ سچ یہ ہے کہ وہ اس میں اپنے استادوں سے بھی گوئے سبقت لے گئے، ان کا عربی دیوان اس

بیان کا شاہد ہے۔

انگریزی تعلیم | اس زمانہ میں انگریزی پڑھنا کفر سمجھا جاتا تھا، مگر یہ کفر مولانا نے توڑا، بچ کے طور پر انگریزی کچھ پڑھ لینے کے بعد کرنل گنج اسکول الہ آباد میں داخل ہوگئے، انٹرنس کا امتحان پرائیوٹ طور پر دے کر ایم اے او کالج علی گڈھ میں داخل ہوئے، یہ علی گڈھ کالج کے اوج شباب کا زمانہ تھا، سرسید اسکے ناظم اعلیٰ، مسٹر آرنلڈ اور بک وغیرہ اس کے پرنسپل اور پروفیسر، اور مولانا شبلی اس کے مدرس، مولانا حالی وہاں کے مقیم ساکن تھے، ہر وقت علمی مسائل و تحقیقات کے چرچے رہتے تھے، اور ان بزرگوں کی صحبتیں حاصل تھیں، جنمیں ہر ہونہار طالب العلم کے فطری جوہر کے چمکنے کا موقع حاصل تھا، مسٹر آرنلڈ فلسفہ پڑھاتے تھے، مولانا کو فلسفہ جدید کا ذوق انھیں کی تعلیم سے ہوا۔

اس زمانہ میں کالج کے ہر طالب العلم کو عربی و فارسی بھی لازماً پڑھنی پڑتی تھی، مگر سرسید نے ان کے متعلق مسٹر بک کو لکھ کر بھیجا کہ حمید الدین عربی و فارسی کے ایسے ہی فاضل ہیں جیسے آپ کے کالج کے استاد اور پروفیسر ہیں، اس لئے ان کو مشرقی علوم کے گھنٹوں سے مستثنیٰ کر دیا جائے، چنانچہ وہ مستثنیٰ کئے گئے۔

مولانا حمید الدین صاحب کی تالیف و تصنیف کا عہد طالب العلمی ہی سے شروع ہوگیا تھا اور خود بزرگوں نے فرمائش کر کے شروع کرایا، اسی زمانہ میں علی گڈھ کالج کے دینیات کے لئے سرسید نے مولانا شبلی مرحوم سے عربی میں سیرۃ نبوی پر ایک مختصر رسالہ لکھوایا تھا، جس کا نام "تاریخ بدء الاسلام" ہے، پھر مولانا حمید الدین صاحب سے اس کا فارسی میں ترجمہ کرایا، استاد و شاگرد کے یہ دونوں عربی و فارسی رسالے اسی وقت چھپ گئے تھے۔

سرسید کو طبقات ابن سعد کا ایک ٹکڑا وفود نبوی کے متعلق کہیں سے ہاتھ آیا تھا، اس وقت تک یہ چھپی نہیں تھی، سرسید نے مولانا حمید الدین صاحب سے اسکا فارسی ترجمہ کرا کے چھپوایا، اس کی زبان ایسی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ عہد سامانی کا کوئی نثر نویس فارسی لکھ رہا ہے۔

غالباً ۱۸۹۲ء میں یا اسکے پس وپیش الہ آباد یونیورسٹی سے بی، اے کی سند حاصل کی۔

۱۸۹۵ء میں عربی میں ایم اے کا امتحان دینا چاہا، مگر نہیں دیسکے[1] ۱۸۹۶ء میں مدرسۃ الاسلام کراچی میں مدرسی کی کوشش کی، سرسید نے سرٹیفکٹ دیا[2] اسی زمانہ میں مسٹر آرنلڈ انگریزی میں عربی گرامر کی ایک مختصر کتاب ترجمہ کرانا چاہتے تھے، اس کیلئے مولانا ہی کا نام ان کے ذہن میں تھا۔[3]

ملازمت | بہرحال مولانا کا تعلیمی عہد ختم ہوگیا ۱۸۹۷ء میں وہ مدرسۃ الاسلام کراچی میں پرفیسر مقرر ہو گئے، یہ مسلمانوں کا ایک انگریزی کا بہت پرانا اسکول ہے، اس کی عمارت بہت شاندار، اور اسٹاف اعلیٰ ہے، اور سندھ میں اس کو کافی شہرت حاصل ہے، مولانا اس میں ۱۹۰۶ء تک رہے، ۱۹۰۰ء میں امیر عبدالرحمٰن خاں والی کابل ایک ترجمہ کا محکمہ قائم کرنا چاہتے تھے، اس میں ابن خلدون کا ترجمہ بھی پیش نظر تھا، اس کے لئے مولانا شبلی نے ان کا انتخاب کیا، مگر کسی وجہ سے یہ تجویز عمل میں نہ آسکی، اور وہ کراچی میں بدستور رہے اور درس و تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف کا شغل جاری رکھا، یہیں کے قیام کے زمانہ میں ۱۹۰۳ء میں ان کا فارسی دیوان شایع ہوا، اور مولانا شبلی مرحوم کے بار بار کے تقاضے سے جیسا کہ مکاتیب شبلی جلد دوم میں ان کے خطوط سے ظاہر ہے، علمی مباحث پر نقد و نظر کی طرف توجہ فرمائی، اور خصوصیت کے ساتھ قرآن پاک کے نظم و بلاغت میں انہماک پیدا ہوا، اور جمہرۃ البلاغۃ نام رسالہ لکھا جس کا خلاصہ مولانا شبلی مرحوم نے خود اپنے قلم سے الندوہ دسمبر ۱۹۰۵ء میں شایع کیا۔

اسی زمانہ میں (غالباً ۱۹۰۲ء میں) جب اس وقت کے ویسرائے لارڈ کرزن نے سواحل عرب اور خلیج فارس کا سیاسی بحری سفر کیا تھا، اور سواحل کے عرب شیوخ اور امراء کو اپنی ملاقات کے لئے جمع کیا تھا، تو مولانا ہی کا انتخاب ترجمان کی حیثیت سے ہوا تھا، وہ اس سفر میں لارڈ کرزن کے ساتھ تھے،

---

[1] مکاتیب شبلی جلد دوم بنام مولانا حمید الدین صاحب خط نمبر ۱، [2] مکاتیب شبلی جلد دوم بنام مولانا حمید الدین صاحب، خط نمبر ۲ [3] ایضاً خط نمبر ۳،

اور عرب سرداروں کے سامنے لارڈ کرزن کی طرف سے جو عربی تقریر پڑھی گئی تھی، وہ انھیں کی لکھی ہوئی تھی۔

۱۹۰۶ء میں گورنمنٹ نے علی گڈھ کالج کو ایک معتدبہ عطیہ عربی تعلیم کے لئے دیا تھا جس کے لئے شرط یہ تھی کہ اس کا پروفیسر کوئی یورپین ہو، چنانچہ جرمن فاضل یوسف ہارویز کا اس کے لئے انتخاب ہوا، ساتھ ہی مولانا کا انتخاب مددگار پروفیسر کی حیثیت سے ہوا، اور وہ علی گڈھ چلے آئے، علی گڈھ میں بھی وہ زیادہ دن نہیں رہے، بہرحال جتنے دن بھی رہے، اپنے علمی کاروبار میں مصروف رہے، ہارویز صاحب مولانا سے اپنی عربی کی تکمیل کرتے تھے اور مولانا ان سے عبرانی سیکھتے تھے، اور ساتھ ہی قرآن پاک کی تفسیر اور تفسیر کے مقدمہ کے اجزاء کی تالیف کا کام جاری تھا۔

مولانا شبلی مرحوم کے تعلق کے سبب سے، پھر خود مولانا حمید الدین صاحب کے ذاتی فضل و کمال کے باعث علی گڈھ کے علمی حلقہ سے ان کے روابط قائم ہو گئے تھے، خصوصاً نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی رئیس حبیب گنج کی ذوق آشنا اور قدر شناس نگاہوں سے وہ کہاں بچ سکتے تھے، چنانچہ اکثر آمد و رفت رہتی تھی، نواب صاحب ممدوح نے مولانا کی وفات کے بعد جو والا نامہ مجھے لکھا ہے اس میں رقم فرماتے ہیں۔

"مجھکو مولانا سے دیرینہ نیاز حاصل تھا، ابتدائی ملاقات کا ذریعہ علامہ (شبلی) مرحوم تھے، علی گڈھ کی پروفیسری کے زمانہ میں ملا، پھر حیدرآباد میں.......... علی گڈھ کے دور میں بھی تدبر قرآنی کا شغف جاری تھا، روزانہ ۹ بجے شب سے صبح کے نو بجے تک اس میں وقت صرف کرتے تھے، ملاقات کے وقت نتائج تحقیق بیان فرماتے، اس زمانہ میں دیگر کتب سماوی کا مطالعہ اور اس کی مدد سے مطالب قرآنیہ کا حل فکر پیش نظر تھا، اسی حالت میں علی گڈھ چھوڑا۔"

اجزاء جو لکھے جاتے تھے وہ مولانا شبلی مرحوم کی خدمت میں بھیجتے رہتے تھے، اور مولانا اسکے متعلق اپنی رائے خطوط میں اور زبانی ظاہر فرماتے تھے، شروع شروع میں استاد کو اپنے شاگرد کے اس نظریہ سے اختلاف تھا کہ قرآن پاک کے مطالب معانی مرتب و منظم ہیں، اور وہ مولانا حمید الدین صاحب کی اس کوشش کو

رائگاں سمجھتے تھے، لیکن جب انھوں نے ان کی تفسیر کے متعدد اجزا دیکھے تو قائل ہوتے چلے گئے اور آخر داد دینے لگے، اور حوصلہ افزائی کرنے لگے، اور آخر آخر میں تو وہ مولانا حمید الدین کی نکتہ دانی کے اس درجہ قائل ہو گئے تھے کہ قرآنی مشکلات کے حل میں وہ ان سے مشورہ لینے لگے،[۱] ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"تفسیر ابی لہب اور جمہرۃ البلاغۃ کے اجزا بغور دیکھے، تفسیر پر تم کو مبارکباد دیتا ہوں، تمام مسلمانوں کو تمہارا ممنون ہونا چاہئے، بلاغت کے بعض اجزا معمولی اور سرسری ہیں، ارسطو کا رد البتہ قابل قدر ہے" (جون ۱۹۰۱ء)

علی گڈھ کے قیام ہی کے زمانہ میں انھوں نے اقسام القرآن لکھی، یعنی اس مشکل کا حل فرمایا کہ خدا نے قرآن مجید میں قسمیں کیوں کھائی ہیں، اس سوال کے جواب میں سب سے پہلے امام رازی نے تفسیر کبیر میں بستہ جستہ فقرے لکھے تھے، پھر ابن القیم نے التبیان فی اقسام القرآن لکھی، مگر مولانا حمید الدین صاحب کی تحقیقات نے اپنی الگ شاہراہ نکالی، اور حقیقت یہ ہے کہ اس بارہ میں انھوں نے ایسی داد تحقیق دی کہ تیرہ سو برس میں اسلام میں کسی نے نہیں دی، مولانا شبلی مرحوم نے ان کے اس رسالہ کا خلاصہ نہایت مسرت اور خوشی کے ساتھ الندوہ اپریل ۱۹۰۷ء میں شایع کیا، اور عربی رسالہ اقسام القرآن کے نام سے الگ شایع ہوا، اسکے بعد اس رسالہ کو مزید تحقیقات سے مؤید کر کے امعان فی اقسام القرآن کے نام سے علی گڈھ میں چھپوایا، اس وقت سے لیکر آجتک مختلف مدعیان تحقیق نے اقسام القرآن پر جو کچھ کہا ہے، وہ تمام تر مولانا کے خوان علم کی زلہ ربائی ہے۔

اس کے بعد اگست ۱۹۰۶ء میں اقسام القرآن کے علاوہ سورۂ ابی لہب اور سورۂ قیامت کی تفسیریں چھپیں اور اہل علم نے ان کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا، علامہ سید رشید رضا صاحب المنار مصر جو خود تفسیر لکھ رہے تھے، انھوں نے ان پر مداحانہ اور معترفانہ تقریظ لکھی اور تحسین کی۔

۱۹۰۷ء کے بعد جب مولانا حمید الدین صاحب کراچی یا علی گڈھ سے وطن آتے جاتے تو لکھنؤ میں بھائی کے

---

[۱] یہ تمام مدارج مکاتیب شبلی کی دوسری جلد میں نظر آئیں گے، [۲] ابھی حال میں دار المصنفین نے مولانا کے اس رسالہ کو مصر سے خوبصورت ٹائپ میں چھپوایا ہے، ایک مہینہ میں امید ہے کہ ہندوستان پہنچ جائے، شاید ۸ر قیمت ہو۔

پاس کچھ دن ٹھہر کر آتے جاتے، اور ۱۹۰۵ء سے مولانا خاص طور سے تقاضا کر کے بلواتے اور اپنے پاس ٹھہراتے،
مقصود یہ تھا کہ ندوہ کے طلبہ ان سے فائدہ اٹھائیں، چنانچہ انھیں کے اصرار سے کئی دفعہ وہ ندوہ میں آکر
رہے اور طلبہ کو کبھی فلسفۂ جدیدہ اور کبھی قرآن کے سبق پڑھائے، میں بھی اس زمانہ میں ندوہ کا طالب العلم
تھا، مولانا کے ان درسوں سے مستفید ہوا۔

اس زمانہ میں مولانا ابو الکلام صاحب مولانا شبلی مرحوم کے پاس ندوہ میں مقیم تھے، اور الندوہ
کے مددگار اڈیٹر تھے، وہ مولانا حمید الدین صاحب کی ان صحبتوں سے مستفید ہوتے رہے، اور قرآن پاک کے
درس و نظر کے نئے راستوں کے نشان پانے لگے، اور بالآخر الہلال کے صفحات میں اس جادہ پیمائی کے
مختلف مناظر، سب کی نظروں کے سامنے آئے، اسی زمانہ میں، ندوۃ العلماء نے انکو اپنی مجلس انتظامی کا
رکن بنایا، اور آخر زمانہ تک وہ برابر رکن رہے۔

مولانا حمید الدین صاحب علی گڈھ میں دو سال کے قریب رہے، اسکے بعد ۱۹۰۸ء میں، الہ آباد
یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے، کالج کی درس کے علاوہ بقیہ اوقات وہ تالیف و تصنیف میں صرف
کرتے تھے، یہیں سے انھوں نے سورۂ تحریم کی تفسیر شایع کی، اور خالص فارسی میں یعنی عربی الفاظ
کی آمیزش کے بغیر، حضرت سلیمان علیہ السلام کے مواعظ کا عبرانی سے فارسی نظم (مثنوی) میں ترجمہ
شروع کیا تھا، مولانا کا الہ آباد ہی میں قیام تھا کہ ان کے اہل برادری میں ایک نئے عربی مدرسہ
کے قیام کی تحریک پیدا ہوئی، مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین صاحب مرحوم نے اس تحریک کی
عنان اپنے ہاتھ میں لی اور ۱۹۱۰ء اعظم گڈھ میں مولانا حمید الدین صاحب کے قریہ پھریہا سے ایک اسٹیشن
بعد سرائے میر نام مقام میں آبادی سے باہر ایک باغ میں اس مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی، مولانا
شبلی نے اس کی نظامت کا بار مولانا حمید الدین صاحب کے کندھے پر رکھنا چاہا، ۱۹ اپریل ۱۹۱۱ء
کے ایک مکتوب میں وہ لکھتے ہیں۔

"کیا تم چند روز سرائے میر کے مدرسہ میں قیام کر سکتے ہو، میں بھی شاید آؤں اور اس کا نظم و نسق درست کر دیا جائے، اس کو گروکل کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہئے، یعنی سادہ زندگی اور قناعت اور مذہبی خدمت مطمح زندگی ہو۔"[1]

اس مدرسہ نے رفتہ رفتہ ان دونوں بزرگوں کے زیر ہدایت ترقی شروع کی، اور یہ لوگ کبھی کبھی اس کو دیکھتے رہے۔

مولانا ۱۹۱۳ء تک الٰہ آباد میں رہے۔

حیدر آباد دکن میں دار العلوم کے نام سے ایک قدیم عربی مدرسہ تھا جس نے حیدر آباد کی علمی و تعلیمی ترقی میں کارنمایاں انجام دیا تھا، اسکا الحاق مدراس یونیورسٹی کے شعبۂ مشرقیات سے تھا، غالباً ۱۹۰۸ء میں مدراس یونیورسٹی نے اس الحاق کو توڑ دیا، اب ریاست کے تعلیمی محکمہ کے ذمہ دار افسروں کو اس قدیم مدرسہ کے جدید انتظامات و تغیرات کی فکر لاحق ہوئی، اور اس کے لئے نواب عماد الملک مرحوم سابق ناظم تعلیمات حیدر آباد دکن، اور مسٹر الما لطیفی آئی، سی، ایس جو اس وقت ناظم تعلیمات تھے، اور مسٹر حیدری وغیرہ نے اہل فن کی مجلس بنائی، جس کے ایک ممبر مولانا شبلی مرحوم تھے، مولانا نے اسکے لئے ایک اسکیم مرتب کی، اور ایک مشرقی یونیورسٹی کی بنیاد رکھنے کی تجویز پیش کی، یہ تجویز اسی وقت الندوہ میں مولانا نے شایع بھی کر دی تھی، مولانا شبلی مرحوم کا اس وقت کا تخیل یہ تھا کہ عربی زبان کی یہ ایک یونیورسٹی ہوگی، جس میں جدید علوم کی بقدر ضرورت آمیزش ہوگی، یہ اسکیم مدت تک زیر بحث رہی، اس اسکیم کے مطابق دار العلوم کو چلانے کے لئے مولانا حمید الدین صاحب کا انتخاب ہوا، اور وہ اسکے صدر (پرنسپل) بنائے گئے، اور ۱۹۱۴ء کے اوائل میں الٰہ آباد سے حیدر آباد چلے گئے۔

حیدر آباد جا کر اس نئی مشرقی یونیورسٹی کے خاکہ بنانے میں مصروف ہوئے، درس و تدریس کے

---

[1] مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۳۳،

علاوہ مدرسہ کی انتظامی نگرانی بھی ان کو کرنی پڑتی تھی، انھوں نے رفتہ رفتہ مدرسہ کی ظاہری و باطنی ترقیوں کی کوششیں شروع کیں، مسٹر الماٹیلیفی سے ان کے خیالات کا اتحاد نہ ہوا، بالآخر ایک دو سال کے بعد مسٹر الماٹیلیفی کی جگہ رس مسعود صاحب نے لے لی، اور انھوں نے ان کے ساتھ ملکر کام شروع کیا۔

مولانا شبلی مرحوم کی فرمائش سے، نواب عماد الملک مرحوم نے قرآن پاک کے انگریزی ترجمہ کا جو کام شروع کیا تھا، وہ نصف کے قریب انجام پا چکا تھا، مگر اس میں جا بجا نقائص تھے، نواب صاحب نے مولانا حمید الدین صاحب کی موجودگی سے فائدہ اٹھایا، اور مدت تک یہ شغل جاری رہا، کہ مولانا روزانہ صبح کو نواب صاحب کے یہاں جاتے، اور نواب صاحب باایں ہمہ ضعف و پیری انگریزی ترجمہ پر مل کر غور کرتے، اور مناسب مشورہ ملنے پر اصلاح و ترمیم کرتے، اس طرح انکے ترجمہ کے کئی پاروں پر نظر ثانی ہوئی، پھر یہ کام رک گیا، لیکن یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ نواب صاحب مرحوم کی وفات کے بعد یہ اصلاح شدہ اجزا اس طرح کاغذات میں مل گئے کہ پھر ان کا پتہ نہ چلا، میں نے نواب صاحب مرحوم کے خلف الرشید نواب مہدی یار جنگ بہادر کو تحریری و زبانی کئی دفعہ انکی تلاش کی طرف توجہ دلائی، مگر انھوں نے ان کے ملنے سے مایوسی ہی ظاہر کی۔

مولانا شبلی مرحوم اس وقت سیرۃ نبوی کی پہلی جلد لکھ رہے تھے، یہود و نصاریٰ اور اہل کتاب کے مناظرانہ مسائل اور قرآن پاک کے استدلالات میں وہ برابر اپنے بھائی سے مشورے لیتے رہتے تھے، جیسا کہ مکاتیب (۷۰-۷۳) سے ظاہر ہے، سیرت جلد اول کے مقدمہ میں حضرت اسمٰعیلؑ کی سکونت اور قربانی کے متعلق جو باب ہے، اس کا مواد مولانا حمید الدین ہی نے بہم پہنچایا تھا، جس کو آئندہ چلکر مولانا حمید الدین صاحب مرحوم نے بڑھا کر اور پھر اور زیادہ استقصا کر کے الرای الصحیح فی من هو الذبیح کے نام سے الگ شائع کر دیا۔ (باقی)

ادبیات

کیا ہوں؟

از جناب مرزا محمد احسان صاحب وکیل اعظم گڑھ

اک گدائے بے نوا ہوں اک فقیر رہ نشین
ہے نظر لیکن مری بالائے فردوس بریں

پیکر خاکی میں رقصاں ہے مرے وہ موج نور
جس سے شرمندہ جمال فطرت روح الامیں

اپنے ہی فطرت کے جلووں کا تماشائی ہوں میں
آستان غیر کی طالب نہیں میری جبیں

ایک مشت خاک ہوں لیکن وہ مشت خاک ہوں
جس کا ہر ذرہ ہے جلوہ گاہ صد مہر مبیں

جس کی نور افشانیوں پر برق لاہوتی نثار
ہے مرے جام سفالیں میں وہ موج آتشیں

جسکی تابانی سے روشن ہے فضائے کائنات
وہ شرار معنوی ہے یہ مری جان حزیں

وہ دل بیدار سینے میں ہے میرے گرم رقص
جسپہ ہے قربان خود حسن لطافت آفریں

عاصی و مجرم ہوں لیکن ہوں وہ رند خود شناس
جس کا ذوق تشنگی منت کش ساغر نہیں

میری ان آنکھوں میں وہ نور محبت ہے نہاں
جو مٹا دیتا ہے دل سے امتیاز کفر و دیں

روح میری اس گداز عشق سے ہے مضطرب
جس سے ہے جنبش میں یہ گہوارۂ چرخ و زمیں

اس سر شوریدہ میں رکھتا ہوں وہ ذوق جنوں
غم نہ جس کو کچھ گریباں کا نہ فکر آستیں

ذرہ ذرہ جس کو آتا ہے نظر یوسف کدہ
مجھکو قدرت نے عطا کی ہے وہ چشم نکتہ بیں

بے نوائی میں وہ شان کج کلاہی ہے مری
جس کے آگے سرنگوں ہے سطوت تاج و نگیں

میرے ظاہر سے نہ کر اندازۂ باطن مرا
قلب ہے میرا منور ہے نظر میری حسین

تلخیصات

رحمت یا لعنت!

ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی نے آج ہمارے سامنے طرح طرح کے سیاسی اور معاشی مسائل پیدا کر دیئے ہیں اور اندیشہ ہے کہ انہی سیاسی اور معاشی مسائل کے اندر سے بہت جلد بعض مذہبی مسائل کی شاخیں پھوٹ نکلیں گی جن پر ارباب سیاست اور ارباب مذہب دونوں کو غور کرنا پڑے گا۔ یہ بہتر ہے کہ اس وقت اس مسئلہ پر مخالف و موافق جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ پیش نظر رہے۔ اسی مقصد سے ذیل کا مضمون شائع کیا جاتا ہے جو پروفیسر ایس جی واتی کے قلم سے نکلا ہے اور "ہندوستان ٹائمز" میں شائع ہوا ہے۔ پروفیسر موصوف فرماتے ہیں:۔

ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی نے بہت سے حلقوں میں ایک سخت اضطراب سا پیدا کر دیا ہے۔ اور وہ اس کو ایک خطرہ سمجھکر اس کو روکنے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں پیش کر رہے ہیں میرے نزدیک یہ لوگ سخت وہمی ہیں اور معاملات پر ان کے صحیح پہلو سے غور کرنے کے عادی نہیں ہیں۔

واقعات جو کچھ بھی ہوں، لیکن یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان کی آبادی غیر معمولی طور پر بڑھ رہی ہے۔ صرف آبادی کے اضافہ کو دیکھنا اور ہندوستان کی ناپیداکنار وسعت پر غور نہ کرنا سخت غلطی ہے۔ اس مسئلہ پر غور کرتے وقت یہ دونوں چیزیں پوری تفصیل کے ساتھ ہمارے سامنے ہونی چاہئیں ہندوستان کے رقبہ کا جائزہ لئے بغیر آبادی کی بڑھوتی کوئی ڈرنے کی چیز نہیں ہے۔

ولایات متحدہ امریکہ میں باعتبار ہندوستان فی مربع میل تگنے آدمی بستے ہیں۔ انفلوئنزا اور جنگ کے مصائب کے باوجود ۱۹۱۰ء اور ۱۹۳۱ء کے درمیان امریکہ کی آبادی میں تقریباً ۲۵ فیصدی کے حساب

اضافہ ہوا ہے۔ درانحالیکہ اس مدت میں ہندوستان کے اندر ۲۰ فیصدی سے زیادہ اضافہ نہیں ہوا۔

لیکن ہمارے لئے صحیح مثال کسی مشرقی ملک کی ہوگی۔ اچھا جاپان کو لیجئے۔ جاپان کا معیار زندگی بہت اونچا نہیں ہے بہت آسانی سے اس کا مقابلہ ہندوستان کے معیار زندگی سے کیا جاسکتا ہے۔ تاہم دیکھئے! آبادی کے اضافہ کے لحاظ سے وہ اسقدر آگے ہے کہ ہندوستان اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ پس یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آج آبادی کے اضافہ کی وجہ سے سب سے زیادہ پریشانی آخر ہم ہی کو کیوں لاحق ہو۔ اور ہم اسی کو وقت کا سب سے بڑا سیاسی اور معاشی مسئلہ کیوں سمجھنے لگیں۔؟؟

معاملہ کا ایک پہلو نہایت دلچسپ ہے کہ آج جو لوگ آبادی کے اضافہ کو ہندوستان کی سب سے بڑی مصیبت قرار دے رہے ہیں وہ یا تو انگریزی حکومت کے ایجنٹ ہیں یا ضبط تولید (Birth control) کے داعی۔ انگریزی حکومت پر ہمیشہ یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس نے ملک کی تجارتی اور زراعتی ترقی کو نہایت سخت نقصان پہنچایا، لیکن حکومت کی طرف سے کبھی یہ اعتراض صحیح تسلیم نہیں کیا گیا اور جواب میں طرح طرح کے عذرات پیش کئے گئے۔

لیکن آہستہ آہستہ اصل حقیقت اسقدر واضح ہوگئی کہ حکومت کے لئے اس سے انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی۔ چنانچہ رائل اگریکلچر کمیشن نے بھی اپنی تحقیقات میں ہندوستانیوں کے اس اعتراض کو بہت حد تک صحیح پایا۔ ان انکشافات کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ انگریزی راج کے ہواخواہ ہیں ان کو فکر ہوئی کہ کسی طرح ہندوستان کی اس مفلسی اور تباہی کے الزام کو حکومت کے سر سے دور کریں اور خود ہندوستان کے سر ڈالیں۔ چنانچہ انھوں نے اس خواہش کے ساتھ طرح طرح کے نظریئے تراشنے شروع کر دیئے۔ ازانجملہ ایک نادر نظریہ یہ ہے کہ ہندوستان کی تباہی اور مفلسی کا اصلی ذمہ دار ہندوستان کا موجودہ معاشرتی نظام ہے۔ مس میو کی مشہور کتاب "Mother India" اسی مقصد کے ماتحت لکھی گئی اور سمجھنا چاہئے کہ اس سلسلہ کی سب سے پہلی اور سب سے نادر کڑی وہی ہے۔

اگر آبادی کا اضافہ رحمت نہیں بلکہ مصیبت اور لعنت ہے، جیسا کہ ہم میں سے بہتیرے سمجھتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ یہ صرف ہمارے ہی لئے کیوں لعنت ہے۔ اٹلی، جرمنی اور جاپان کیلئے کیوں لعنت نہیں ہے جنکی آبادی بے اندازہ بڑھ رہی ہے۔ اور ان کے سامنے اس کے روکنے کا کوئی سوال نہیں ہے؟ بلکہ ان کو اس بات پر بڑا فخر ہے۔ وہ اس کو اپنی طاقت کا اضافہ اور ملک کی ترقی سمجھتے ہیں۔ اور پوری مسرت کے ساتھ اسکی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔

انگلینڈ جو اس باب میں نسبۃً "قدامت پرست" خیال کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اضافہ آبادی کی حوصلہ افزائی نہیں کر رہا ہے تاہم وہاں مدبرین کے سامنے یہ خطرہ ضرور ہے کہ بعض جدید رجحانات کی وجہ سے کہیں اسکی آبادی میں غیر معمولی کمی نہ واقع ہو جائے اور اسکی طاقت گھٹ نہ جائے۔

الغرض جبکہ تمام دنیا اضافۂ آبادی کو ایک رحمت سمجھ رہی ہے۔ یا کم از کم اسکی کمی سے خطرہ محسوس کر رہی ہے، ہندوستان تنہا ایک ایسا ملک ہے جو اپنی آبادی کے اضافہ سے خائف ہے۔ اور کسی طرح اس لعنت سے رہائی پانیکی تدبیریں سوچ رہا ہے۔

ایک دلچسپ اور عجیب بات یہ ہے کہ ہندوستان کے سیاسی حالات اور مذہبی رجحانات اضافۂ آبادی کے حق میں ہیں۔ جمہوری نظام حکومت کے انعقاد نے اقلیتوں میں اپنا پوزیشن سنبھالنے کے لیے ایک خاص ہما ہمی اور سرگرمی پیدا کر دی ہے کیونکہ انکو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ نظام حکومت کے اندر انکا وزن انکی آبادی کے تناسب ہوگا۔ اس خیال نے تمام اقلیتوں میں ایک قسم کی مسابقت کی لہر دوڑا دی ہے۔ اور ہر ایک اس کوشش میں منہمک ہے کہ اپنی آبادی میں اضافہ کر کے نظام حکومت میں اپنی حیثیت زیادہ سے زیادہ مضبوط کرے۔ گول میز کانفرنس کے زمانہ میں آغا خان نے امریکہ کو جو بیان براڈکاسٹ کیا تھا اس میں اسی طرح کے ولولہ کا اظہار کیا گیا تھا۔ انھوں نے نہایت پرامید لہجہ میں فرمایا کہ مسلمان ہندوؤں کے مقابل میں زیادہ سرعت کیساتھ اپنی آبادی بڑھا رہے ہیں اور توقع ہے کہ دس برس ختم ہوتے ہوتے ۱۲۰۰ ملیون تک پہنچ جائیں گے۔

بعض مہاسبھائی ہندوؤں مثلاً ڈاکٹر منجے وغیرہ نے یہ سنا تو اسکو ایک چیلنج سمجھا اور ان کو اس کے مقابل میں ہندو آبادی کو بڑھانے کی فکر ہوئی۔ انھوں نے اپنا گول بہت آگے بڑھکر قائم کیا۔ ان کے خیال کے لحاظ سے ہندوؤں کی تعداد ... ملیون ہونی چاہئے کیونکہ ڈاکٹر منجے کے نزدیک مہابھارت کے وقتوں میں ہندوؤں کی آبادی اسی قدر تھی۔

ان انفرادی رجحانات اور اضطراری حالات کے باوجود عام خیال یہی ہے کہ آبادی غیر معمولی سرعت کیساتھ بڑھ رہی ہے اور اس کو کسی نہ کسی طرح رُکنا چاہیئے؟ روکنے کی صرف دو ہی صورتیں ہیں ضبط نفس (Self control) یا ضبط تولید (Birth control)۔ ضبط نفس نہایت عمدہ چیز ہے لیکن ہم کو امید نہیں ہے کہ یہ اسقدر عام ہو سکے گی کہ ہندوستان کی آبادی کا مسئلہ اس سے حل کیا جاسکے۔

اب صرف برتھ کنٹرول کا مصنوعی طریقہ رہ گیا۔ لیکن موجودہ حالات کے اندر اسکے بھی عام ہونیکی امید نہیں ہے۔ ہندوستان کی عام پبلک جو بالکل بے پڑھی لکھی ہے، کتنی ہی وسعت کے ساتھ پروپگنڈا کیا جائے، اسکو نہ تو قبول کر سکتی نہ عمل میں لاسکتی۔ جن طبقوں میں اس طرح کے مصنوعی طریقوں کو قبول کرنے اور برتنے کی صلاحیت موجود ہے ان میں بھی صحت اور کامیابی کے ساتھ اسکو برتا نہیں جاسکا تو عام پبلک کا جو ان نزاکتوں کے سمجھنے اور عمل میں لانیکا دماغ نہیں رکھتی کیا حال ہوگا؟ فرض کرلو کہ یہ طریقہ چل گیا اور عوام و خواص سبنے اس نازک فن کو سیکھ لیا تو کیا اس کا خطرہ نہیں ہے کہ اس کے معاشرتی نقصانات ایک دن پورے ملک کو تباہ کرکے چھوڑ دیں؟

ان وجوہ سے ہندوستان میں آبادی کے مسئلہ پر جب جب غور کیا گیا میں نے یہی سمجھا کہ یہ بحث و تمحیص بالکل لاطائل ہے۔ اول تو یہ کوئی اہم مسئلہ ہی نہیں ہے اور اگر کچھ اہمیت رکھتا ہے تو کم از کم اتنی بات تو ضرور ہے کہ ابھی اس پر غور کرنے کا وقت نہیں آیا ہے۔ ہم نے وقت سے بہت پہلے اس پر غور کرنا شروع کر دیا ہے۔

بروقت ہم کو جن مسائل پر غور کرنا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہیں۔ ہم کو ملک میں معاش کے نئے وسائل پیدا کرنے چاہئیں۔ اور نئے پیشے اور نئی صنعتیں ایجاد کرنی چاہئیں۔ زراعت اور صنعت کی نئی راہیں کھولنی چاہئیں۔ غذا کے مسئلہ پر غور کرنا بھی کچھ نہ کچھ مفید ہوگا بشرطیکہ پوری وسعت کے ساتھ غور کیا جائے۔ ہماری کوششیں ایجابی ہونی چاہئیں۔ سلبی کوششوں کا وقت ابھی نہیں آیا ہے۔

تقریظ و تبصرہ

اسلام اور عروج سائنس و تمدن:- مصنفہ مولوی عبدالکریم صاحب بی۔اے۔ایم۔ایل۔سی۔ مترجمہ جناب شیخ عبدالمجید صاحب بی۔اے۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۶۳ صفحے۔ کاغذ عمدہ کتابت وطباعت نہایت روشن قیمت ۲/ ملنے کا پتہ مرقوم نہیں۔ غالباً کلکتہ میں مترجم کے پتہ سے مل سکے گی۔

مذکورہ بالا عنوان پر یہ مقالہ پہلے انگریزی میں چھپا تھا۔ اب اسے اردو میں ترجمہ کرکے چھوٹی سی کتاب کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں اس خیال کی پرزور تردید کی گئی ہے کہ "اسلام ترقیات اور علوم وفنون کا مانع ہے"۔ قرآنی آیات، احادیث اور تاریخی شواہد سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام علوم وفنون کی راہ میں روک نہیں، بلکہ جملہ علوم وفنون کا معاون و سرپرست ہے۔ قرون اولی کے مسلمانوں نے علوم وفنون کی بہت زیادہ خدمت کی اور کتنے مردہ علوم کو دوبارہ زندگی بخشی ہسپانیہ کا عربی تمدن ہی موجودہ مغربی تمدن کا سرچشمہ ہے۔ اور آج یہ جو کچھ نظر آرہا ہے سب اسلام ہی کا رہین احسان ہے، مصنف نے مخالفین کے بیانات اور انہی کی تحریری شہادتوں سے یہ واضح کردیا ہے کہ اسلام نے دیگر مذاہب کے مقابلہ میں سائنس کو زیادہ ترقی دی۔ اور جملہ علوم وفنون میں سے بعض کو مسلمانوں نے ایجاد کیا اور بعض کے مٹے ہوئے نشانات کو پھر سے روشن کیا۔ غرض اس عنوان پر اختصار کے باوجود یہ مضمون نہایت اچھا ہے۔

دعوت: اڈیٹر مولوی مطلوب الرحمان صاحب ندوی۔ تقطیع ۲۶×۲۰/۴ ضخامت ۱۲ صفحے۔ کاغذ در کتابت وطباعت عمدہ۔ قیمت سالانہ تین روپئے۔ ششماہی ۱۲/۔

ملنے کا پتہ:- دفتر دعوت، الہ آباد۔ یو۔پی

یہ پندرہ روزہ تبلیغی اخبار ابھی حال میں جاری ہوا ہے۔ اب تک اس کے صرف دو نمبر نکلے ہیں۔ امکان اچھی ہے اور اگر اللہ تعالےٰ نے اس کے استقلال کا سامان کر دیا تو انشاء اللہ اس سے تبلیغ دین کی مفید خدمتیں انجام پائیں گی۔ اس اخبار کا مقصد یہ ہے کہ اچھوتوں اور ہندوستان کی دوسری پست اقوام کے سامنے اسلامی مساوات، اسلامی معاشرت اور دوسری اسلامی تعلیمات کی خوبیاں نہایت آسان زبان میں پیش کی جائیں تاکہ آج جو جماعتیں پست حال ہیں اور انکی پست حالی پر مذہب اور روایات کی سند قایم ہو چکی ہے دیکھ سکیں کہ دنیا میں ایک مذہب ایسا بھی موجود ہے جس نے نسل و خون کے تمام امتیازات مٹا کر بلندی و برتری کی بنیاد نیکی اور تقوی پر قائم کی ہے۔

مولوی مطلوب الرحمان صاحب نگرامی، جو اس اخبار کے اڈیٹر ہیں۔ تبلیغی کاموں کا ذوق اور تجربہ رکھتے ہیں بلکہ یہ چیز ان کا خاندانی ورثہ ہے اس لئے اگر ہم ان سے یہ توقع کریں تو بیجا نہ ہوگی کہ وہ اس راہ کی دشواریوں کے برداشت کرنے کے اہل ثابت ہوں گے۔

اخبار میں چند مضامین ہندی بھاشا زبان میں بھی ہوتے ہیں جو ناگری رسم الخط میں چھپتے ہیں۔ یہ چیز ہم کو نہایت پسند ہے۔ انشاء اللہ اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچے گا۔

تفسیر سورۂ تحریم: یہ کتاب نہایت اہم مباحث پر مشتمل ہے
اس میں مصنف نے ازواج مطہرات نبوت کے متعلق تمام
الزامات کی بدلائل تردید کی ہے۔ شان نزول کے متعلق
نہایت اہم اصولی بحثیں ہیں۔ قیمت ۴؍

تفسیر سورۂ المرسلات: اس میں سورہ کی توجیہات اور صحت
قرآن کی تمام ترتیبات کے متعلق نہایت اہم نکتے بیان
کئے گئے ہیں۔ یہودیوں کے تحریفات سے معاد پر استشہاد کے
یہ پہلو نہایت دقیق ہیں۔ قیمت ۳؍

تفسیر سورۂ عبس: اس میں انبیاء کے خلق عظیم اور ان کی عصمت
اور ان کے مواقع عتاب کے متعلق نہایت اہم مباحث ہیں۔ قیمت ۳؍

تفسیر سورۂ الشمس: شمس و قمر وغیرہ سے قرآن کے عام اسلوب
استدلال کی توضیح کی گئی ہے۔ سورہ کے غیبی اشارات اور ان کے
وقوع کی تفصیلات دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ [illegible]
کی تفسیر خاص موہبت ربانی ہے۔ قیمت ۴؍

تفسیر سورۂ والتین: اس میں تین، زیتون، طور سینین
بلد امین سے وجوہ استشہاد اور ان کی تحقیق کے متعلق مصنف کی
محققانہ تحقیق اور وسعت نظر کا اعجاز ہے۔ قیمت ۴؍

تفسیر سورۂ الکوثر: کوثر کی حقیقت کے متعلق اس قدر مدلل لکھا ہے
کہ بحث کا کوئی گوشہ محجوب نہیں رہ گیا ہے۔ نماز اور قربانی کی حقیقت
اور ان کے باہمی تعلق کی تفصیل طویل اور نہایت ایمان
افروز ہے۔ قیمت ۴؍

تفسیر سورۂ الکافرون: اس میں بعثت کی غایت اور ہجرت کے
نتائج کے متعلق ایسے نکتے بیان ہوئے ہیں جن کا سمجھنا قرآن کے
بعض مقامات و حصوں کے سمجھنے کیلئے نہایت ضروری ہے۔ قیمت ۴؍

تفسیر سورۂ الفیل: اس کا اردو ترجمہ الاصلاح میں شائع ہو چکا
ہے جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے گا۔ قیمت ۵؍

تفسیر سورۂ اللہب: اس میں عام خیال کی مدلل تردید کی گئی ہے کہ
یہ سورہ بددعا ہے۔ ابو لہب اور اس کی بیوی کے وجوہ ذکر نہایت
[illegible] گئے ہیں۔ قیمت عربی ۴؍ ۔ اردو ۲؍

الرأی الصحیح فی من ہو الذبیح: اس میں بائبل کی کتابوں کے دعویٰ
کے خلاف قرآن اور تورات کے محکم دلائل سے حضرت اسماعیلؑ
کا ذبیح ہونا ثابت کیا ہے۔ قیمت ۱۰؍

امعان فی اقسام القرآن: اس میں ثابت کیا گیا ہے کہ
قرآن کی قسمیں استدلال اور شہادت کیلئے ہیں۔ قیمت ۸؍

تفسیر سورۂ اخلاص: سورہ اخلاص کی تفسیر اردو زبان میں۔ قیمت ۵؍

اسباق النحو حصہ اول و دوم: اردو زبان میں عربی صرف و نحو
کے بہترین رسالے۔ قیمت حصہ اول ۴؍ حصہ دوم ۴؍

دیوان حمید ۶؍ ۔ خرد نامہ ۸؍ ۔ تحفۃ الاعراب ۴؍

ملنے کا پتہ: مکتبہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۹۰۲

دائرہ حمیدیہ کی اعانت

دائرہ حمیدیہ کی خدمت و اعانت، کتاب الٰہی کی خدمت و اعانت ہے، اس کی اعانت کی تین صورتیں ہیں

۱۔ جو حضرات سو روپئے یکمشت دائرہ کو عنایت فرمائیں گے وہ دائرہ کے معاون دائمی تصور ہوں گے۔ ان کو دائرہ کا رسالہ "الاصلاح" اور تمام مطبوعات برابر ہدیۃً دی جائیں گی

۲۔ جو حضرات پچاس روپیہ یکمشت عنایت فرمائیں گے۔ ان کو رسالہ الاصلاح اور دائرہ کی دوسری مطبوعات برابر نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

۳۔ جو حضرات دس روپئے سالانہ عنایت فرمائیں گے ان کی خدمت میں الاصلاح ہدیۃً جاری کیا جائے گا اور سال بھر کی مطبوعات با قیمت بھیجی جائیں گی۔

ہدایات و قواعد

۱۔ الاصلاح ہر انگریزی مہینہ کی پندرہ ۱۵ تک شائع ہوگا۔

۲۔ اگر مہینہ کے آخر تک پرچہ نہ پہنچے، فوراً دفتر کو لکھکر منگوا لیجئے ورنہ بقیمت بھیجا جائے گا۔

۳۔ مضامین وغیرہ اڈیٹر کے نام بھیجئے اور دفتر سے متعلق امور کے لئے تمام خط و کتابت منیجر سے کیجئے۔

۴۔ دفتر سے خط و کتابت کرنے میں خریداروں کو نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہئے۔

۵۔ چندہ سالانہ چار روپئے۔ بیرون ہند کے لئے چھ روپئے۔ فی پرچہ چھ آنے

عبدالاحد اصلاحی، منیجر دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ

عبدالاحد طابع و ناشر نے اصلاح پریس مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ میں چھپوا کر شائع کیا